ہفت پیکر

حفیظ

ہفت پیکر

قیمت 6 روپے

نقوش پریس میں باہتمام علاء الدین منظہر نمائندہ خاص مصنف
طبع ہوئی۔ اور مجلس اردو ۴۴ جی ماڈل ٹاؤن لاہور سے شائع کی

بے حقیقت سا دل جو ٹوٹ گیا
بن گئے بے شمار افسانے

ہفت پیکر

ابو الاثر حفیظ جالندھری

کے

عہدِ جوانی میں لکھے ہوئے افسانوں کا مجموعہ

دیباچہ از

سید امتیاز علی تاج

(اس اشاعت میں اہلِ قلم کے لئے حفیظ کی اُسی دَور کی ایک اہم تحریر بھی اضافہ ہے)

مجلسِ اردو۔ کتاب خانہ حفیظ۔ اردو بازار لاہور

معیاری افسانے ۔ طلب کیجئے

حفیظ نے مغرب کے بہترین افسانوں کو اپنی زبان اور اپنا لباس پہنا رکھا ہے ۔

انتساب

بنامِ سیّد سجّاد حیدر یلدرم

محشر کا تماشا ہے اک نقل جوانی کی
گذرا ہوا ہنگامہ بھولا ہوا افسانہ

فہرس

گھروندے

سب بچے گھروندے بناتے ہیں۔ اپنے اردگرد جو کچھ دیکھتے ہیں۔ اپنے اپنے تخیل کی بساط پر ننھے ننھے ہاتھوں سے اپنی انفرادیت کو اپنے شوق میں سمو کر ریت گتے یا تنکوں کی تعمیریں اٹھاتے ہیں ان تعمیروں کو اپنی تخلیق جانتے گردانتے ہیں۔ خود بار بار ان کو دیکھتے اور سنوارتے بناتے ہیں دوسرے بچوں کو دکھاتے ہیں۔ بیداد پر بسورتے اور داد پر خوشی کے نعرے لگاتے ہیں — پھر ...... پھر بھول جاتے ہیں۔

ہم — ادبی دنیا کے اطفال بھی یہی کھیل کھیلتے ہیں — کوئی انشاپرداز، کوئی شاعر، کوئی افسانہ نگار ایسا نہیں — جس کا آغاز گھروندے بنانے سے نہ ہوا ہو۔ ان گھروندوں میں طفلانہ فکر کے ساتھ ساتھ ہی اپج بھی ہوتی ہے۔ عقل اور اپج دونوں کچھ اس طرح آمیز ہوتے ہیں کہ ان گھروندوں کے قریب سے گزرنے والے بالغ نظر لوگ مسکرائے بغیر یا کوئی فقرہ چست کئے بغیر نہیں گزر سکتے۔

میں بھی طرح طرح کے گھروندے بنایا کرتا تھا۔ میرے بہت سے گھروندوں میں یہ سات افسانے بھی ہیں۔ جن کو میں بھول گیا تھا — وہ دور اب بہت دور چلا گیا ہے۔ زمانہ اتنا آگے بڑھ آیا ہے۔ کہ گذشتہ و رفتہ کو اس کے سامنے لانے سے کوئی فائدہ نظر نہیں آتا بجز تعفن — میں نے یہ افسانے کسی خاص مقصد کو سامنے رکھ کر یا کسی معاشرتی اصول کی تبلیغ کے لئے نہیں لکھے تھے۔ میرے دور کے دوسرے بچے کچھ گھروندے بنا رہے تھے۔ میں نے بھی بنا دئے اور بس

حفیظ

۳۰ رجون ۱۹۵۹ء

یہ افسانے

ہفت پیکر سات طبعزاد افسانوں کا مجموعہ ہے۔ یہ ساتوں افسانے حفیظ صاحب نے ۱۹۲۴ء میں یعنی ان دنوں تخلیق کئے تھے جب آپ رسالہ ہزار داستان کے ایڈیٹر تھے۔ ان دنوں مختصر افسانہ نویسی نئی نئی تھی۔ اور جیسا کہ سید امتیاز علی تاج صاحب نے اپنے دیباچے میں اشارا کیا ہے۔ واقعی تعجب انگیز ہے کہ اس دور کی اردو دنیا میں طبعزاد مختصر افسانے کی ادبیت کا سہرا بھی کم و بیش حفیظ ہی کے سر ہے۔ پریم چند یا ایک دو اور مصنفوں کے سوا حفیظ ہی اپنی شاعری کی جدتوں کے ساتھ ساتھ صحیح معنوں میں مختصر افسانے کا موجد بھی نظر آتے ہیں۔ اس دور کے دوسرے وہ جو افسانہ نگار کہلاتے تھے۔ سچی بات یہ ہے کہ انگریزی ناولوں اور انگریزی میں ترجمہ شدہ غیر ملکی مختصر افسانوں کو کسی نہ کسی طرح ادل بدل اور الٹ پلٹ کر اپنے دیس کا مختصر افسانہ بنا دینے کے سوا اور کچھ نہ کرتے تھے۔ یہ مبارک بات ہے کہ حفیظ انگریزی پڑھے نہ تھے۔ ساتھ ہی ان کو دوسروں کا اگلا ہوا نگلنے اگلنے سے بھی نفرت تھی۔ غالباً یہی سبب ہے کہ وہ اردو شعر و شاعری ہی نہیں مختصر افسانہ نویسی میں بھی دوسروں کے رہنما بن گئے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ افسانہ نویسی کی راہ میں اپنے نقش قدم چھوڑ کر اپنی منزل کی طرف چل دیئے۔

موجودہ دور میں بہت سے بلند رتبہ طبعزاد افسانہ نویس ہیں جن کو اردو میں نام و مقام حاصل ہے۔ ترقی پسندی کی حوصلہ مندی کے طور پر نقادانِ فن کے جیتے رات دن ان افسانہ نگاروں کے کمالات کی منادی فرماتے ہیں اس لئے مناسب نہیں کہ ۱۹۲۴ء کے لکھے ہوئے افسانوں کے موازنے کی دعوت دی جائے۔ میرا کام تو صرف یہ ہے کہ اپنے چچا کی پرانی تحریروں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالنے اور دنیا کے سامنے پیش کرنے پر اکتفا کروں۔ لہٰذا ان سات افسانوں کے علاوہ ایک اور تحریر بھی اس کتاب میں شامل کر رہا ہوں جو حفیظ چچا نے دسمبر ۱۹۲۶ء کے مخزن میں شائع کی تھی میری رائے میں یہ تحریر بھی ترقی پسندی کے مقابل حقیقت پسندی کا ایک جیتا جاگتا افسانہ ہے۔ یعنی لٹریچر کے بارے میں

حفیظ کی جوانی کے دنوں کا تصور ملاحظہ فرمائیے۔ (علاء الدین مظہر)

اہلِ قلم سے

بڑی کتابیں — (اداریہ رسالہ مخزن، دسمبر ۱۹۲۷ء)

جب تک یہ طلسم ہستی قائم ہے انسانی دنیا کی کوئی چیز ضائع نہیں ہو سکتی۔ ایک کتاب۔ ایک فقرہ۔ ایک لفظ کبھی فراموش یا گم نہیں ہوتا۔ ہم غلطی کا ارتکاب فرما کر اکثر بھول جاتے ہیں۔ اور کچھ دیر بعد سمجھ لیتے ہیں کہ بات آئی گئی ہو گئی لیکن غلطی کی پاداش ہمارے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ جب ہم اخلاق کی زنجیروں کو توڑتے ہیں تو اس شکست کی آواز دنیا میں گونجتی ہے۔ باتیں اعمال بلکہ خیالات کتنے ہی خفیف اور بے حقیقت کیوں نہ سمجھے جائیں لیکن وہ عارضی نہیں بلکہ ابدی ہیں۔ خراب لفظ کبھی معدوم نہیں ہوتا۔ بلکہ سو گنی قوت کے ساتھ صدائے بازگشت بن کر ہم کو اور ہماری نسل کو سزا دینے آجاتا ہے۔ یہ قیامت کے بعد بھی قائم رہے گا۔ چنانچہ مذہبی آیات و اقوال میرے دعوے کی دلیل ہیں: "آدمی جو کچھ کہے گا حشر کے دن اس کا جواب دہ ہو گا۔ اپنی ہی باتوں سے بے گناہ ثابت ہو گا۔ اپنی ہی باتوں سے سزاوار ٹھہرایا جائے گا"۔

بری مثالیں اور برے کام جب بھی پیدا ہوتے ہیں یا پیدا کئے جاتے ہیں ہمیشگی کی زندگی ساتھ لاتے ہیں اور کبھی نہیں مرتے مرنا تو کجا کہانی کے دیو کی طرح ان کے ہر قطرۂ خون سے ہزاروں ویسے ہی خونخوار دیو انسانی اخلاق کو نگل جانے کے لئے پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ زندگی کے نقوش زندگی کے ساتھ ہی ناپید نہیں ہو جاتے۔ جو کچھ کیا جاتا ہے جو کچھ کہا جاتا ہے قائم رہتا ہے۔ اور کبھی برباد نہیں ہوتا۔ اچھی باتوں کی طرح بری باتیں بھی ورثے کے طور پر ایک سے دوسرے۔ دوسرے سے تیسرے تک پہنچتی اور بڑھتی پھیلتی ہیں۔ کوئی فعل ایسا نہیں جو نتائج کی ایک لمبی زنجیر کی پہلی کڑی نہ ہو۔

ہر ذرہ جو نیکی سے مزین اور بدی سے آلودہ کیا گیا ہو۔ دنیا اس کو مستقل طور پر قائم رکھتی ہے۔ زمین و آسمان کی

درمیانی فضا ایک وسیع صفحہ ہے جس پر انسان کی ہر بات نقش ہو جاتی ہے۔ خواہ وہ بلند آواز سے کہی گئی ہو یا سرگوشی کے انداز میں ہو یا ارادے اور خیال میں مرکوز ہے۔ خیالات، الفاظ اور اعمال کا اثر انسان اور اس کے ہم جنسوں کی تقدیر پر پڑتا ہے۔ ہر ایک زندگی جس طرح بھی گذاری جائے نتائج کا ایک لامتناہی سلسلہ باقی جاتی ہے۔ یہ سلسلہ ان نسلوں تک پھیلتا رہتا ہے۔ جو ہمارے بعد پے در پے ہماری قائم مقام بنتی ہیں۔

جب خیالات و الفاظ کی برائی کا یہ حال ہے تو جان لینا چاہئے کہ بری کتابوں اور برے لٹریچر کے بد اثرات کس قدر ہولناک نتائج پیدا کرتے ہوں گے۔ اس دعوے کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں کہ بری کتاب برے کاموں اور برے لفظوں سے بہت ہی بری ہوتی ہے کیونکہ وہ آئندہ نسلوں کے خیالات کو برائی کے سانچے میں ڈھالتے رہنے کا زبردست ذریعہ بن جاتی ہے۔

مصنف خاک میں مل کر خاک ہو جاتا ہے مگر اس کی تصنیف زندہ رہتی ہے۔ بری کتاب کا مصنف نوعِ انسانی کی تباہی کا باعث بنتا ہے۔ وہ تو مر جاتا ہے لیکن اس کی کتاب برائی بداخلاقی اور شرارت پھیلاتی رہتی ہے۔

بیشک ہمارے زمانے میں چھاپے کے فن کی ترقی پر شکوہ اور بہت مفید ہے لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ یہی چھاپے کا فن گندی تحریریں زہریلے رسائل شر افشاں کتابوں کی نشر و اشاعت و شہرت کا آلہ بنا ہوا ہے اس سے لچر اور پوچ اور بیہودہ تصانیف کی خوفناک پیداوار میں فراوانی ہو رہی ہے۔ جو بلند خیالی شرافت اور مذاقِ سلیم کی قاطع ہے۔ ایک مفکر نے کیا عمدہ بات سادگی سے کہدی ہے "کاش اہلِ قلم کو معلوم ہو جائے کہ ہر بھلائی کے لئے جو ظہور میں آتی ہے اور ہر برائی کے لئے جسے دلنشیں کیا گیا ہے صرف مصنف ہی ذمہ دار ہیں۔ ذہنی کوڑھ سے بھری ہوئی کتابیں خوبصورت لباس پہن کر ہمارے مطالعے میں آتی اور ہمارے کتب خانوں میں داخل ہو جاتی ہیں۔ ہمارے گھروں میں گھس کر ہماری زندگی کو جذام آلودہ کر دیتی ہیں۔

آج کل آرٹ آرٹ کا شور مچایا جاتا ہے۔ ہم اس آرٹ کو کیا کریں جو ہمارے بچوں کو بداخلاقی سکھاتا ہو۔

ہم جلدات کے اندر حسین بندشوں، عبارت کے مرغوب اور دلآویز فقروں اور کتاب کی نفیس گٹ اپ کو کیا کریں جب وہ بدی سے معمور ہو۔

یہ قول نہایت شر انگیز ہے کہ "فن کو فن کی حیثیت سے دیکھنا چاہئے" بعض لوگ کہتے ہیں کہ اگر نفاست کو پیش نظر رکھا جائے تو برائی کا آدھا اثر دور ہو جاتا ہے۔ یہ خیال بہت ہی گمراہ کن ہے۔ کیونکہ وہ برائی بہت ہی خطرناک ہے جو رنگین لفظوں اور حسین بندشوں میں مرصع ہو کر ہمارے دل میں کھب جائے

مثال کے طور پر ہم اُن گھناؤنی کہانیوں، افسانوں اور ناولوں کو پیش کر سکتے ہیں جو نہایت نفیس عبارت آرائی کے ساتھ لاکھوں کی تعداد میں فروخت کئے جاتے ہیں اور جن کو ہمارے نوجوان شوق سے مزے لے لے کر پڑھتے ہیں پھر آپ خود ان کے پیش کی کوشش کرتے ہیں۔ ان افسانوں اور ناولوں کی رسائی شریف گھرانوں کی عورتوں تک بھی ہو جاتی ہے ایسے افسانوں اور ناولوں کے آغاز میں ایک بیباک جوان اور ایک پردہ نشین کے درمیان قومی روایات اور قوانین کے خلاف بے باک "معاشقہ" ہوتا ہے (میں اسے معاشقہ کہہ کر لفظِ عشق کی توہین نہیں کرنا چاہتا) اور اختتام ایک خاندان کی بے عزتی ایک ناموس کی بربادی پر کیا جاتا ہے۔ اور یہ سب کچھ آزادی خیال کے نام پر ہو رہا ہے۔ ہمارے اکثر افسانوں میں چوری قتل و غارت نفس پرستی اور خود غرضی کی ترغیبیں رہتی ہیں۔ ہمارے نوجوان چمکدار تحریروں سے چندھیا جاتے ہیں اندھے ہو کر پڑھتے ہیں۔ اور برباد ہو جاتے ہیں ساتھ ہی ان ننگے سنائی گیتوں کا اثر دیکھئے جو ہماری مجلسی زندگی میں دخل انداز ہو رہے ہیں اور جو نوجوانوں کی صحبتوں میں بطور نقل محفل استعمال کئے جاتے ہیں جن کو ریڈیو یا سنما کے ذریعے گھروں بازاروں اور گلیوں میں گایا جاتا ہے اور جن سے ملک کی فضا تھرتھرا رہی ہے۔

حسن کے اثرات اور عشق کے جذبات کو ہم برا نہیں کہتے ہم ان کو زندگی کیلئے ضروری سمجھتے ہیں لیکن حسن انسان کے دل میں اعلیٰ و ارفع جذبات پیدا کرتا ہے۔ اور عشق خودداری شرافت اور فروتنی کو ابھارتا ہے۔ ٹھنڈے دل سے غور کر کے اور جواب دو کہ ایسے گیت جو ملک کے بچے بچے کی زبان پر چڑھ جاتے ہیں کیا! ان میں بس ہجر کاری

کے جذبات کا اظہار کھلم کھلا نہیں کیا جاتا۔ اور کیا ان کے مصنّف واقعی بداخلاقی کا زہر پھیلانے کے مرتکب نہیں ہوئے
یہ سچ ہے اچھی کتاب دس ہزار برس گذشتہ میں بھی لکھی گئی ہو آج بھی کامیاب زندگی کا مقصد مقرر کر سکتی ہے لیکن بری
کتاب معاذاللہ۔ اس کی آواز ساحرہ کے گانے کی طرح جادو بھری ہوتی ہے۔ یہ جوانوں کے جذبات کو ہیجان میں
لاکر انھیں مجرمیت پر اکساتی ہے۔ بری کتاب کے مصنّف اپنی قبروں میں سے سڑاندھ اگلتے ہیں اور تمام دنیا ان کی
گندہ ذہنی سے بدبودار ہو جاتی ہے۔

کتاب ایک زندہ آواز ہے جو روئے زمین پر چکر لگاتی ہے۔ یہ ایک ایسے شخص کا زندہ خیال بنی رہتی ہے جو
ہمارے ملک ہماری ملّت اور ہمارے وقت سے خارج ہو چکا ہے۔ انسانی خیال ہی ہے جو پائندہ ہے۔ خیال ہی ہے جو
پیچھے باقی رہ جاتا ہے جسے فنا نہیں۔ سقراط اور افلاطون کیا ہوئے۔ غزالی اور سعدی کہاں ہیں۔ ان کی مٹّی مٹّی میں مل گئی
لیکن وہ خود زندہ ہیں پائندہ ہیں اپنی تمام نیکیوں اور شرافتوں کے ساتھ زندہ ہیں۔ اِس لیے کہ ان کے خیالات
ان کی تصانیف زندہ و پائندہ ہیں۔

اسی طرح وہ مصنّف شاعر اور فلاسفر بھی زندہ ہیں جنہوں نے اپنے کسی ذاتی فائدے کو مدّنظر رکھ کر یا کسی ترغیب کے
زیر اثر اپنے زورِ قلم کو شیطانی جنبشوں کے سپرد کر دیا تھا۔ اگر اچھی کتاب زندگی کا خزانہ ہے تو بری کتاب ایک ڈائن ہے
جو کلیجہ چاٹ جاتی ہے۔ اچھی کتاب وہ ہے جو راست بازی سچائی اور شرافت کی تعلیم دے۔ انصاف اور انسانیت کے
اصول سمجھائے۔ ہم ان کتابوں کو بری سمجھتے ہیں جو خودغرضی بے اعتمادی بداعتقادی اور سفلی جذبات پیدا کرنے
میں مدد دیتی ہیں جو جذبات کو ہیجان میں لاکر انسان کو جانور بننے پر اکساتی ہیں۔

اِس موضوع پر بہت کچھ لکھا جانا چاہیئے لیکن فی الحال میں کسی مُردہ مصنّف کا نام اِس لیئے نہیں لیتا۔
اُس کی تصنیف کا اِس لیئے ذکر نہیں کرتا کہ مبادا لاکھوں جوانوں میں سے ایک کے دل میں اس کے مطالعے کا شوق
پیدا ہو جائے جس کی ذمہ داری مجھ پر عائد ہو گی اور کسی زندہ مصنّف کا نام لینے سے اس لیئے پرہیز ہے کہ وہ خود ہیں

اگر کہیں اور زیادہ گندگی نہ اچھالے۔ اس وقت میں صرف خدا ملک و ملت اور آئندہ نسل کا نام لے کر منت کرتا ہوں کہ ایسے ادب کو پڑھنے اور ایسی کتابیں لکھنے سے ہمارا دورِ حیات بدنام ہوتا ہے اور جس سے آئندہ نسلوں کی بربادی کا احتمال ہے۔ ورنہ آنے والا زمانہ ہم پر لعنت بھیجے گا۔

اس مضمون کو ختم کرنے سے پہلے ایک کہانی بھی سن لیجئے جو میری تصنیف تو نہیں البتہ میں نے اسے اخذ کر کے اپنے اسلوب سے لکھا ہے۔

مصنّف اور ڈاکو

روحوں کی مملکت میں عادل کے سامنے فیصلے کے لئے دو گناہگار ایک ہی وقت میں پیش ہوئے ان میں سے ایک بہت بڑا سفّاک ڈاکو تھا۔ اور شاہراہ پر تلوار کے زور سے مال اور جان کو غارت کیا کرتا تھا جسے انسانی دنیا میں آخر کار پھانسی کی سزا ملی تھی۔ دوسرا ایک مصنّف تھا۔ بڑا مشہور بڑا نامور۔ اس نے اپنی تصانیف میں زہرِ ہلاہل حل کر دیا تھا۔ اس نے حسین الفاظ اور رنگین عبارتوں کے ذریعے بداخلاقی کا وعظ کیا تھا۔ انسانی دنیا میں مرنے کے بعد بھی اس کی شہرت بدستور قائم تھی۔

عدالتی کارروائی شروع ہوئی۔ اور روحوں کے ملک میں یہ کارروائی بہت ہی مختصر ہوتی ہے وہاں بے فائدہ وقت ضائع نہیں کیا جاتا فیصلہ فوراً سنا دیا جاتا ہے۔ چنانچہ لوہے کی دو بڑی دیگیں موٹی زنجیروں میں باندھ کر معلق لٹکائی گئیں۔ ایک دیگ میں ڈاکو کو بٹھا دیا گیا۔ دوسری میں مصنّف کو دونوں دیگوں کے نیچے ایندھن کے بڑے بڑے انبار چن دیئے گئے اور حکم دیا گیا کہ آگ دکھا دی جائے۔

ایک تادیبی روح اٹھی اور اس نے دائیں ہاتھ سے ڈاکو کی دیگ کے نیچے انبار کو آگ دکھائی۔ اور بائیں سے مصنّف کی دیگ کے نیچے۔ ڈاکو کی دیگ تلے آگ اتنے زور سے بھڑک اٹھی۔ کہ ایوانِ جہنم کی چھت کے پتھر بھی چٹخنے لگے اور چشم زدن میں یہ سزا ختم ہو گئی۔

مصنّف کی سزا کچھ زیادہ سخت نہیں معلوم ہوتی تھی۔ کیونکہ اس کی دیگ کے نیچے پہلے پہل آگ کی لو بھی مشکل سے پھوٹتی تھی لیکن یہ سلگتی گئی۔ بڑھتی گئی۔ سلگتی گئی بڑھتی گئی ——— !

صدیاں گذر گئیں اور روحوں کی دنیا میں صدیاں بہت لمبی ہوتی ہیں۔ مصنّف کی دیگ تلے آگ بجھنے میں نہ آئی۔ حالانکہ ڈاکو کی دیگ تلے کی راکھ بھی سرد ہو چکی تھی۔ مصنّف کی دیگ تلے جیسے جیسے وقت گذرتا جا رہا تھا شعلے تیز اور تیز تند اور تند ہوتے جا رہے تھے۔ جب مصنّف نے اپنے عذابوں میں کمی ہوتے نہ دیکھی تو آخر کار چلا اٹھا۔ "باری تعالےٰ یہ کیا انصاف ہے؟ میں نے اپنی طبّاعی سے کام لے کر دنیا کو اپنی شہرت سے بسا دیا تھا۔ ہاں یہ درست ہے کہ میں نے نسوز آزادی سے کام لیا تھا۔ تو اس گناہ کی سزا مجھے مل چکنی چاہیئے۔ بھلا پھر کیا میں نے اُس ظالم اور ہلاکو ڈاکو سے بھی زیادہ گناہ کیا ہے۔"

اس کے یہ کہتے ہی ایک فرشتۂ عذاب ہاتھ میں خونریز تازیانہ لئے نمودار ہوا۔ جس کے ہر ہر مُو سے پھنپھناتے سانپ زبانیں نکال رہے تھے۔ فرشتۂ عذاب بولا۔ کم نصیب! کیا تُو خدا کو الزام دیتا ہے! کیا تُو اپنا مقابلہ اُس ڈاکو سے کرتا ہے جس کا جرم تیرے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھا۔ اس نے تو صرف اتنی مدّت بے رحمی کی تھی جتنی مدّت وہ زندہ رہا۔ لیکن زمانے بیت گئے۔ قرن ہا قرن گذر گئے اگرچہ زمین پر تیری ہڈیاں گل کر خاکستر بن چکی ہیں۔ پھر بھی ہر نئی صبح وہ برائیاں پھیلاتی ہوئی طلوع ہوتی ہے۔ جن کی تخلیق تیرے سبب سے ہوئی۔ تیرا پھیلایا ہوا زہر جیسے جیسے وقت گذرتا جاتا ہے مہلک سے مہلک تر بنتا جاتا ہے یقین نہیں تو دیکھ ———

چشم زدن میں مصنّف کے سامنے دنیا آئینہ ہو گئی۔ فرشتہ بولا۔ دیکھ ان بچوں کو جو اپنے خاندان کیلئے شرم کا باعث ہیں۔ دیکھ ان بوڑھوں کو جو گمراہ رہے ہیں اور مایوس ہیں۔ ان کے دل و دماغ کس نے خراب کئے۔ تُو نے ——— ! کس نے شادی کے قوانین کا مضحکہ اڑایا۔ کس نے دین و ایمان کو فضول

بتایا کس نے پاکیزگی کے خیالات کو بیوقوفی لکھا۔ کس نے سماجی پابندیوں کو توڑنے کی تعلیم دی؟ تُو نے ——! کیا تُو نے بدی کو رنگا رنگ لباس ہائے فاخرہ پہنا کر حسین و دلربا صورتوں میں پیش نہیں کیا۔ کیا تُو نے ہوس کاری کو محبت نہیں بتایا۔ کیا تو نے بے حیائی کی نظر فریب تصویریں نہیں کھینچیں؟ اب دیکھ انسانی دنیا تیری تعلیم سے گمراہ ہو کر قتل غارت فساد اور بغاوت سے بھر گئی ہے۔ اصل تو ہی ہے جس نے ان کو تباہی کے گڑھے کی طرف جانے کی ترغیب دی تھی۔ ان کے ہر آنسو اور خون کے ہر قطرے کے لئے تو اور صرف تُو ذمہ دار ہے۔ اور ابھی اس تباہی کا کون اندازہ لگا سکتا ہے جو تیری تصانیف سے آگے ہی آگے پھیلتی جاتی ہے۔ کیا اب بھی تُو خدائے عادل کو الزام دینے کی جرأت کرے گا۔ یہ سزا کی جگہ ہے اور یہاں سزا گناہ کے مطابق ملتی ہے۔"

یہ کہا اور غضبناک فرشتۂ عذاب نے دیگ کا ڈھکنا زور سے بند کر دیا۔

مقدّمہ

از سیّد امتیاز علی تاج

ادبِ اُردو میں حفیظ صاحب کو جو شہرت اور ناموری حاصل ہے۔ وہ تمام تر اُن کی شاعری کی ممنونِ احسان ہے۔ اور اس میں اُن کے مختصر افسانوں کو ذرا بھی دخل نہیں۔

جو لوگ انہیں بحیثیت شاعر کے جانتے ہیں۔ ان میں سے اکثر کو علم نہ ہوگا کہ وہ مختصر افسانے لکھتے ہیں۔ مجھے یقین ہے۔ اگر ان سے کہا بھی جائے کہ حفیظ کے افسانے ان کی شاعری سے کم قابلِ قدر نہیں۔ تو فی الحال کوئی اس پر غور کرنے کو آمادہ نہ ہوگا۔

لوگ حفیظ کی شاعری سے اس قدر متاثر ہو چکے ہیں کہ اب انہیں کسی دوسری حیثیت میں دیکھ کر داد دینے کی مطلق گنجائش نہیں رہی۔

حفیظ صاحب نے اپنے مختصر افسانے کتنے ہی چاؤ سے لکھے ہوں اور

مختصر افسانہ سے دلچسپی رکھنے والے گنتی کے چند لوگ ان کو کتنا ہی پسند کرتے رہیں ان کے افسانوں کو اب وہ داد نہیں مل سکتی جس کے وہ حقیقت میں مستحق ہیں۔

ہمیشہ سے یوں ہی ہوتا آیا ہے جو لوگ شکسپیئر کے نام سے واقف ہیں ان میں سے کتنوں کے ذہن میں یہ خیال موجود رہتا ہوگا۔ کہ وہ "سانیٹس" لکھنے میں بھی کمال رکھتا تھا۔ غالب کے متعلق کسی سے پوچھئے۔ کہ آپ اسے کس حیثیت سے جانتے ہیں؟ "اردوئے معلیٰ" کی بے مثال نثر کا بہت کم لوگوں کو خیال آئے گا۔ دُنیا صرف ایک ہی حیثیت سے کسی کو غیر معمولی داد دیا کرتی ہے۔ بیک وقت دو حیثیتوں سے اعترافِ کمال کرنا اس کی بساط سے باہر ہے۔

ایسی حالت میں حفیظ کے افسانوں کی خصوصیات میں کتنے ہی خلوص اور محنت سے لکھوں کوئی سننا پسند نہ کرے گا۔ جہاں حفیظ نظم پڑھ رہا ہو۔ وہاں کسی اور موضوع پر کسی کو کوئی اور بات سنانا ناممکن ہے۔ کوئی سُنے گا بھی تو اس کے گوشۂ چشم میں شبہ جھلکتا رہے گا۔ سننے کے بعد کسی کو خوشی حاصل نہ ہوگی۔

پھر اردو میں بمقابلہ شعر کے مختصر افسانہ کا ذوق بہت کم ہے۔ ہمارے لٹریچر میں شعر کا قابلِ قدر ذخیرہ موجود ہے ہمارے ہاں شعر کی روایات ہیں۔ ہم ان ہی میں پلتے بڑھتے ہیں۔ شعر کے متعلق ہر پڑھے لکھے ہندوستانی کا کچھ نہ کچھ ذوق بن جاتا ہے۔ اس کے

لے نیم براعظم۔ بھارت اور پاکستان۔

مقابلے میں مختصر افسانہ ایک بالکل نئی چیز ہے۔ اس کے نہ اعلیٰ نمونے ہماری زبان میں ہیں۔ نہ اسکے متعلق ہمارے کوئی خیالات ہیں۔ ان حالات میں بھلا کون سننا چاہے گا کہ شاعر حفیظ قابلِ قدر افسانہ نویس بھی ہے۔

مگر میرے دل میں انہی حالات کے باعث خصوصیت سے حفیظ کے افسانوں کی قدر ہے۔ اردو کی موجودہ حالت کو مدنظر رکھتے ہوئے حفیظ کی شاعری مجھے اتنی غیر معمولی نہیں معلوم ہوتی جتنی حفیظ کی افسانہ نویسی۔

اُردو میں مختصر افسانہ بطورِ اصطلاح کے جو معنی آج کل اختیار کرتا جا رہا ہے وہ ہمارے دیس کی پیداوار نہیں بلکہ مغرب سے آئے ہیں اور اردو کے لئے ابھی تک اتنے اجنبی ہیں کہ ہماری زبان مختصر افسانہ کے صحیح مفہوم ہی سے بڑی حد تک ناآشنا کہی جا سکتی ہے۔

مغرب کے اعلیٰ مختصر افسانے نسبتاً بہت کم تعداد میں اردو میں ترجمہ ہوئے ہیں۔ اکثر انگریزی دان اردو نویس جن افسانوں کا ترجمہ کرتے ہیں یا جن افسانوں کو اپنے سامنے بطور نمونہ رکھ کر خود طبع آزمائی کرتے ہیں۔ وہ انگریزی کے ادنیٰ رسائل میں محض تجارتی اغراض سے لکھے جاتے ہیں۔

ان میں نہ مختصر افسانہ کی کوئی خصوصیت ہوتی ہے۔ اور نہ ادب کی، نہ حکیمانہ مشاہدۂ فطرت ہوتا ہے نہ فلسفیانہ ادراکِ حیات اور نہ نفاست و شستگی کا اظہار۔

مغرب کی تیزیٔ رفتار اور عورت مرد کی مخلوط زندگی کے باعث یہ افسانے ایک ادنیٰ قسم کی

دلکشی سے محروم نہیں ہونے پاتے اور عوام کے لئے تفریح کا اچھا خاصا سامان بہم پہنچا دیتے ہیں۔

مگر اس قسم کے ترجمے یا اس انداز کے طبعزاد افسانے زبان اردو میں مختصر افسانہ کا صحیح ذوق کسی طرح پیدا نہیں کر سکتے۔ چنانچہ ان کی موجودگی میں بھی یہی کہنا پڑتا ہے کہ اردو زبان مختصر افسانہ سے بڑی حد تک ناآشنا ہے۔

لیکن اجنبیت کی اس حالت میں اگر حفیظ کے افسانوں میں بعض ایسی خصوصیات نظر آئیں جو مغرب میں اس مغربی صنفِ ادب کا طرّۂ امتیاز سمجھی جاتی ہیں تو میرا اسے ایک غیر معمولی بات کہنا غالباً نامناسب نہ قرار دیا جائے گا۔

اور پھر حفیظ مغربی زبانوں سے بھی ناواقف ہیں۔ چنانچہ اُن گنتی کے چند اعلیٰ مختصر افسانوں سے جو بُری بھلی طرح اُردو میں منتقل ہوئے ہیں۔ ان کا مختصر افسانے کے محاسن کو نامعلوم طریق پر اخذ کر لینا میرے لئے حیرت انگیز ہے۔ ان کے افسانے مختصر نہیں بلکہ واقعی مختصر افسانے ہیں۔ اس سے میری مراد کیا ہے۔ یہ مجھے کسی قدر تفصیل سے بیان کرنا ہو گا۔

اصطلاح کی صورت اختیار کرنے سے پہلے مختصر افسانہ کا لفظ صرف ان افسانوں کیلئے استعمال کیا جاتا تھا۔ جن کی نمایاں خصوصیت محض اختصار ہوتی تھی۔

لیکن انیسویں صدی میں بعض اور خصوصیات مختصر افسانہ میں اس کثرت سے نمایاں ہونے

لگیں۔ اور ان کے اظہار کے لئے یہ میدان ایسے جداطور پر مخصوص ہو گیا کہ مختصر افسانہ اور وہ خصوصیات گویا لازم و ملزوم بن گئیں۔ اس طرح مختصر افسانے کے معنوں میں زمین و آسمان کا فرق پڑ گیا۔ اور اس لفظ نے ایک اصطلاح کی صورت اختیار کر لی۔

انیسویں صدی میں مغرب کے غور و فکر کے طریق میں ایک یہ انقلاب پیدا ہوا کہ لوگوں نے اشیاء سے جدا اُن کے تاثر کو اہمیت دینی شروع کر دی۔ اس اندازِ خیال کا اثر تمام فنونِ لطیفہ پر پڑا۔ اور اس رجحان نے افسانے کی دنیا میں ایک صورت مختصر افسانہ کی اختیار کر لی۔

اس اندازِ خیال کے رواج پانے سے واقعات کی طرح تاثرات بھی افسانہ نویسوں کو زیادہ اہم معلوم ہونے لگے۔ تجرباتِ زندگی کی طوفانی رَو میں کوئی مؤثر صورتِ حالات یا نمایاں تضاد انہیں شدت سے محسوس ہوا تو ان کا جی چاہنے لگا کہ اسے اسی شدت سے دوسروں کو بھی محسوس کرائیں۔

کئی تاثرات ناول کی مروجہ وسعت و ضخامت کے لحاظ سے غیر متناسب معلوم ہوئے اور انہیں ناول کے واقعات کے سلسلے میں بیان کرنے سے ان کی اہمیت زائل ہوتی نظر آئی۔ اس لئے ان کے اظہار کے واسطے مختصر افسانہ کا میدان مناسب معلوم ہوا۔

پہلے تو مختصر افسانہ میں صرف یہ خصوصیت ہوتی تھی کہ اس میں کم واقعات کی کہانی ہو۔ اب اس کی یہ خصوصیات بن گئیں کہ اس میں کسی واحد تاثر کو احسن طریق پر منتقل کرنے کے لئے کم سے کم

مناسب واقعات ہوں۔

مصنفین نے مختصر افسانے لکھنے کو واقعات کی لڑی بنانی چھوڑ دی جب انہیں کوئی واحد تاثر انوکھے طور پر محسوس ہوتا تو اسے پورے طور پر پڑھنے والے کو منتقل کرنے کے لئے ڈ موزوں واقعات بنانے لگے۔

تاثر کی وحدت نے مصنفین کو خاص طور پر محتاط کر دیا کہ اپنے پہلے فقرے سے لے کر آخری فقرے تک ایک لفظ بھی ایسا نہ لکھیں کہ پڑھنے والے کے دماغ کو مطلوبہ اثر قبول کرنے سے بے راہ کر سکے۔ چنانچہ اس طریق کی احتیاط سے واحد تاثرات کی ایسی مکمل اور واضح تصاویر عبارت میں بننے اور دلوں میں اترنے لگیں جو کسی طرح سے ناولوں میں پیش نہ کی جا سکتی تھیں۔

اردو کے بہت کم مختصر افسانوں میں یہ بات نظر آتی ہے۔ اکثر مصنفین کے افسانوں سے واضح ہوتا ہے کہ ان کے افسانے محض اسی وجہ سے مختصر ہیں۔ کہ ان کے لئے نسبتاً کم واقعات کی ایک لڑی بنائی گئی ہے۔

ہمیں ابھی عام طور پر زندگی کو اس نقطۂ نظر سے دیکھنے کی عادت نہیں ہوئی۔ جو مغرب میں میں انیسویں صدی نے پیدا کر دی تھی۔ تجربات زندگی میں اس قسم کے تاثرات مختصر افسانے کا مواد بنتے ہیں۔ جو ہمیں محسوس ہوئے بغیر گذر جاتے ہیں۔

لیکن حفیظ خصوصیت سے ایسے تاثرات کو محسوس کرتا ہے۔ جو مختصر افسانہ کے لئے مناسب و

موزوں ہوتے ہیں اور پھر یہ بھول کر کہ مخلوط و منتشر زندگی کے واقعات یا خیالات نے ان تأثرات کا احساس دلایا تھا۔ وہ اپنے مختصر افسانے کے لئے از سرِ نو ایسے واقعات تعمیر کرتا ہے جو نہایت باقاعدگی اور خوبصورتی سے مطلوبہ اثر پڑھنے والے پر وارد کر دیتے ہیں۔

مثلاً "آوارگی" کو لیجئے۔ اس میں ذہنی لمحے کا تأثر افسانہ کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ جب سوسائٹی کے مغرور کے لئے بے عنان زندگی اپنی تمام رعنائی اور دلکشی کھو چکتی ہے اور ذمہ داریوں کی عدم موجودگی روح میں ایک ایسا خلا پیدا کر دیتی ہے جو ذمہ داریوں کے بوجھ سے زیادہ دردانگیز معلوم ہوتا ہے۔

یہ تأثر ایک خاص طرح کی ذہنی نشوونما اور دماغی کیفیت کے باعث مصنّف کو محسوس ہوا اور ضروری نہیں کہ ان ہی حالات و کیفیات میں ایک دوسرا شخص بھی اسے محسوس کر سکتا چنانچہ یہ بھی ضروری نہیں کہ جس سلسلہ خیال کے باعث یا جن حالات کو دیکھ کر مصنّف نے اسے محسوس کیا، اگر وہ بجنسہٖ کاغذ پر لکھ دیئے جائیں تو دوسرا شخص جس کی ذہنی نشوونما اور دماغی کیفیت بہرحال مصنف سے مختلف ہے اسے مطلوبہ شدّت و وضاحت سے محسوس کرے۔ چنانچہ محض اس اثر کو منتقل کرنے کیلئے مختصر افسانہ کے فن سے امداد لینے کی ضرورت ہوئی۔

وہ مکمل تأثر جو دماغ میں ایک مبہم صورت میں موجود تھا اس کے اقتضا کو مدِّنظر رکھ کر کہانی کے لئے مفید طلب مواد جمع کیا گیا۔

"بادو باراں کی آمد آمد کی وجہ سے بازار بے رونق اور سنسان تھے خوانچے والے تمباکو فروش۔ تنبولی نصف شب تک لہرا لہرا کر گرما گرم چائے کی صدا لگانے والے آج دس بجے ہی اپنے بچے کھچے سودے سمیٹ ممٹا گھروں کو جا چکے تھے۔ اکّا دکا مسافر بہکے ہوئے شرابی۔ آوارہ مزاج سیلانی۔ تماش بینوں کے گروہ طوفان کی آمد آمد دیکھ کر اپنے اڈوں کی خیر منا رہے تھے۔"

ان حالات کے باعث آوارہ شخص معمول سے پہلے اپنے ٹھکانے پر واپس آجانے کیلئے مجبور ہو گیا۔ جو وقت عام طور سے باہر بازاروں کی گہما گہمی میں صرف ہو جایا کرتا تھا۔ آج خلاف معمول گویا آوارہ گرد کے سر پر کھڑا ہوا تھا۔

سرائے میں ایک غیر معمولی خاموشی تھی جس میں ہوا سیٹیاں بجا رہی تھی۔ موسم کی وجہ سے آوارہ گرد کی طبیعت پر ایک اضمحلال اور افسردگی طاری تھی۔ دماغ زیادہ خیالی چیزوں میں مصروف نہ ہو سکتا تھا۔ اپنے گرد و پیش کی چیزیں زیادہ شدّ و مد سے اسے اپنی طرف متوجّہ کر رہی تھیں۔

"فرسودہ چارپائی۔ نامکمل بستر۔ چند پرانے ادبی رسائل۔ چارپائی کے دونوں طرف سینکڑوں سگرٹوں کے جلے ہوئے ٹکڑے۔ سوختہ دیا سلائیاں سگرٹ کے خالی بکس۔ میلے ورلے کاغذ۔ گرد آلود میلی اور پان کی پیکوں سے داغدار دیواریں۔ اکھڑا ہوا فرش جس پر ہر طرف مونگ پھلی کے چھلکے بکھرے پڑے تھے۔"

اس جگہ آوارہ گرد نے کوٹ اتارا صبح سات بجے کا پہنا ہوا بوٹ پیروں سے جدا کیا اور اپنے بستر میں گھس گیا۔ جو پانچ راتوں سے از سرِ نو نہ بچھایا گیا تھا۔

"موم بتی تمام ہو جانے کی وجہ سے مطالعہ کی ناکام کوشش ختم کر دینے کے سوا چارہ نہ رہا۔ اور اندھیرے میں آوارہ گرد کا خیال ماضی و حال کے طوفانی سمندر میں غوطے کھانے لگے۔ اور ایک غیر معلوم خوف ایک موہوم ہراس آہستہ آہستہ اس کے قلب کی حرکت تیز کرنے لگا۔

آوارہ گردی کے اضمحلال کا جو تاثر مصنف کے دماغ میں موجود تھا۔ اسے واضح کرنے کیلئے اب یہ اکتا دینے والا ماحول ایسا اعتماد انگیز بن گیا جس میں پڑھنے والے کا خیال آوارہ گرد کی ذہنی کیفیت سے ہمدردانہ اشتراک کر سکتا تھا۔

اگر اس ماحول کا بیان نہ ہوتا اور مثلاً کہانی یک لخت آوارہ گرد کے جذبات سے شروع ہوتی۔ تو اس کے اور پڑھنے والے کے احساسات ہمدردانہ طور پر مشترک نہ ہونے پاتے۔ اور مصنف جو تاثر پیدا کرنا چاہتا تھا۔ وہ اپنا زور کھو ڈالتا۔

اس طرح تمام کہانی کو دیکھئے۔ ہر نیا خیال بالواسطہ یا بلاواسطہ تمہیں تاثر سے قریب تر کرتا چلا جا رہا ہے۔ اور ہر فقرے کی تہ میں مصنف کا مقصد پورے طور پر موجود ہے۔

اور واقعی مختصر افسانے میں ایک ایک فقرہ بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ ذرا مقصد سے ہٹا

تو اس غلط سُر کی طرح نمایاں معلوم ہونے لگتا ہے جسے باجہ بجانے والا غلطی سے چھو کر راگ کو بے ڈھنگا بنا ڈالتا ہے مثلاً جس جگہ بازار کی ویرانی اور آوارہ گرد کے خلاف معمول سے جلد گھر واپس آجانے کا ذکر ہے۔ وہاں فقرہ ہے کہ :۔

"میرے لیئے اس کے سوا چارہ کار نہ رہا۔ کہ آج معمول سے پیشتر اپنی ویران کوٹھڑی کی خیال آفریں تنہائی میں چلا جاؤں۔"

اگر اس کے آگے یہ بھی لکھ دیا ہوتا کہ "چنانچہ گذشتہ رات مَیں نے جو تھیئٹر دیکھا تھا میں اُس کی ٹھمریاں گاتا ہوا سرائے کی طرف روانہ ہوگیا۔" تو آوارہ گرد کے طریق زندگی کو دیکھتے ہوئے شاید اس فقرے کو بے موقع نہ کہا جا سکتا لیکن اس کی طبیعت پر اضمحلال کے جس اثر کو دکھانا تھا۔ اس کے لحاظ سے ٹھمری گاتے ہوئے گھر لوٹنے کا خیال راگ کے غلط سُر کی طرح دماغ کو صدمہ پہنچاتا۔

غلط اثر پیدا کرنیوالے فقروں کے ساتھ مختصر افسانہ میں مختلف چیزوں کے بیان کی مقدار بھی بہت اہمیت رکھتی ہے جہاں مختصر افسانہ میں سے بیان کا تناسب دور ہوا مصنّف اپنے مقصد میں واضح طور پر ناکام ہو جاتا ہے۔ اردو مصنّفین میں تناسب کی سمجھ بہت کم ہے۔ اگر ایک چیز کے متعلق ان کے مشاہدات کثیر اور دلچسپ ہیں اور مختصر افسانہ کے دوران میں اسی کے استعمال کی ضرورت پڑ گئی۔ تو پھر اپنے مشاہدات کے اظہار کا شوق اعلیٰ افسانہ لکھنے کی آرزو پر غالب آجاتا ہے۔ وہ اپنے مشاہدات میں سے حسب ضرورت مواد منتخب نہیں کر سکتے۔ بلکہ تمام احتیاطوں سے بے پروا ہو کر چھوٹ بنتے ہیں۔

اندھیرے میں لیٹے لیٹے آوارہ گرد کا خیال ماضی وحال کے طوفانی سمندروں میں غوطے کھا رہا ہے :۔

"میں نے اس کو چھوڑ دیا" یہ الفاظ میرے کانوں میں کوئی آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا۔ میں نے لیٹے لیٹے ایک گہرا سانس لیا اور کوشش کی کہ ماضی کی ناگوار یاد میرے حافظے سے محو ہو جائے۔

مگر ایک متوسط درجے کے مکان میں ایک معمر بزرگ کی مظلوم صورت بکیسانہ انداز سے مجھے گھور رہی تھی۔ اس کے آنسو اس کی سفید داڑھی کو تر کر رہے تھے۔

"آہ میرا باپ"۔ وہ باپ جس نے اپنی زندگی کی تمام آسائش میری ترقی وبہبود کی امید کے ہاتھ فروخت کر رکھی تھی۔ جس نے مجھ پر بھروسہ کرنے میں پدرانہ شفقت کے ساتھ قدرے سادہ لوحی کا ثبوت بھی دیا تھا۔

اس کی آنکھیں مجھے اس خاموش تاریکی میں ملامت سے گھور رہی تھیں! دور کالے کوسوں دور میں اپنی ماں کے غمناک چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ عین اسی بے لبسی کی حالت میں جس طرح سے میں نے اسے چھوڑا تھا۔"

ماں باپ کی محبت کی کتنی تصویریں ہر شخص کے ذہن میں محفوظ ہوتی ہیں۔ ماں باپ کا نام زبان پر آتے ہی کتنے بہت لوچ دار واقعات دماغ میں گھسنے لگتے۔ ان سب کو ہاتھوں میں لے کر تولنا صرف اپنے افسانہ کی ضرورت کے اعتبار سے چند چیزیں لے لینا اور خیال کی باقی تمام رعنائیوں اور دلکشیوں کی طرف پیٹھ کر دینا مختصر افسانہ نویس کا سب سے بڑا امتحان ہوتا ہے۔

اِن احتیاطوں سے مختصر افسانہ لکھا جاتا ہے۔ اور یہی احتیاطیں ہیں جن کی بنا پر میں نے حفیظ صاحب کے افسانوں کو اردو میں غیر معمولی چیز کہا تھا۔

میں ایک ہی افسانے کے تجزیئے میں اتنے بہت صفحے لکھ چکا ہوں۔ کہ باقی افسانوں پر تفصیل سے اظہارِ رائے کرنا اور اُنکی خوبیوں کیطرف پُورے طور سے توجہ دلانا اس موقع پر دشوار ہے۔

"افسانہ در افسانہ" میں پنجاب کی دیہاتی زندگی جیسی مکمل تصویر ہے۔

"ہوشیار دیوانہ" میں جیسے کمال اور احتیاط سے بتدریج انکشافِ سیرت کیا گیا ہے۔

"حیاتِ تازہ" میں محلِ وقوع نے جو شادابی اور رعنائی پیدا کی ہے۔

"خودکشی" میں پنجاب کے نچلے متوسط طبقے کی غیر منظم زندگی کے جس پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

"طمع" میں اندھے دیوتا کی فریب کاریوں کو جس لطف سے ظاہر کیا گیا ہے اور

"سہاگ کی رات" میں مسرت کے نقاب کے نیچے سے جو ہیبت پیدا ہوتی دکھائی گئی ہے

ان پر تفصیل سے اظہارِ خیال بہت فرصت چاہتا ہے۔

اور پھر یہ امید تو کی جا سکتی ہے۔ کہ حفیظ کی شاعری کے بے شمار قدردان شاید حفیظ کے افسانے پڑھ لیں لیکن مختصر افسانہ کے فن پر کوئی طویل اور خشک مضمون پڑھنا غالباً اُن کے لئے زیادہ دلچسپی کا موجب نہ ہو۔ ایسی حالت میں میں جو کچھ لکھ چکا ہوں اگر وہی توجہ سے پڑھ لیا گیا تو میں اپنے لئے غنیمت اور حفیظ کی افسانہ نویسی کے محاسن سمجھنے کے لیئے کافی تصوّر کروں گا:

تاجؔ

میری پلکوں پر غنودگی کا ہلکا سا بوجھ تھا

سہاگ کی رات

رخصت کے وقت عجیب سماں تھا میرا خُسر اور اُس کے دونوں بیٹے پلیٹ فارم پر کھڑے تھے گیس کی روشنی میں اُن کے افسردہ چہروں پہ حُزن و ملال کے جذبات کا سایہ پڑتا دکھائی دے رہا تھا۔

مَیں نے خیال کیا۔ شادی بھی کیا تماشا ہے۔ اس میں خوشی اور غم کے دو حیرت انگیز نظارے دوش بدوش نظر آجاتے ہیں۔

انجن نے سیٹی دی۔ مسافر جو باہر ٹہل رہے تھے جلد جلد ریل کے درجوں میں سوار ہونے لگے۔ میرے خُسر نے کانپتا ہُوا ہاتھ میرے سر پہ پھیرا۔ اور میرے والد سے مصافحہ کیا۔ میرے برادران نسبتی کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے

تھے۔ میں نے بخندہ پیشانی اُن کو سلام علیک کہی۔

ریل گاڑی چل کھڑی ہوئی مسافروں کی چیخ و پکار اور خوانچہ فروشوں کی سامعہ خراش صداؤں کے درمیان خدا حافظ کی بہت سی آوازوں نے ہمیں رخصت کیا۔ لاہور کا اسٹیشن انبوہ کثیر کے ساتھ متحرک نظر آنے لگا۔

مَیں کچھ دیر کھڑکی سے باہر سر نکالے خاموشی سے لالٹینوں اور عمارتوں کی طرف دیکھتا رہا۔ میرے دل میں مسرت کے سمندر موجیں مار رہے تھے۔ مَیں صحرائے ہستی میں ایک خوش نصیب مسافر کی طرح ریگستان کی جلتی دُھوپ سے نکل کر ایک ایسے گلزارِ پُربہار میں جا رہا تھا۔ جہاں طرح طرح کے سایہ دار درخت میووں سے لدے کھڑے تھے۔ جہاں سرد پانی کے مصفا چشموں کے کنارے رنگین اور معطر جھاڑیوں میں خوش الحان پرند مبارک باد کے نغمے الاپ رہے تھے۔

میری زندگی کا بالکل نیا اور نہایت خوشگوار دَور شروع ہو گیا تھا میرے جامِ مسرت میں برائے نام بھی تلخی نہ تھی۔ میری خرمی کے افق پر کوئی تاریک دھبہ نہ تھا۔ مجھے اپنی اُمیدیں مسکراتی دکھائی دیتی تھیں۔

تمناؤں کے بعد میری شادی ہوئی تھی سو اور مَیں اپنی دلہن کے ساتھ

اپنے گھر کی طرف پلٹ رہا تھا۔

ذوقِ خیالات نے میرے دماغ کو بہ یک وقت جوشِ مسرت اور فکرِ شعر کا جولان گاہ بنا رکھا تھا۔ اور میں اس ہنگامے کے درمیان کبھی کبھی ایک آدھ دل افروز مصرع گنگنانے لگتا تھا۔ گاڑی میانمیر کے اسٹیشن پر رکی ہمارا کمرہ ریزرو تھا۔ جس میں صرف ہم چار افراد آرام کر رہے تھے۔ مقابل کی نشست پر میرے والد لیٹے ہوئے سونے کی کوشش میں مصروف تھے اُن سے اگلی نشست پر میری والدہ اور سب سے آخری نشست پر دُلہن اپنے رنگین لباس پر ایک گرم لبادہ اوڑھے سمٹی سمٹائی بیٹھی تھی۔

ٹرین ایک اسٹیشن پر رکی پھر چلنے اور فراٹے بھرنے لگی۔

میں نے ایک شریر نگاہِ شوق اپنی دلہن پر ڈالی۔ وہ ایک حسین گٹھڑی معلوم ہوتی تھی۔ میری دزدیدہ نگاہیں اس کے گھونگھٹ میں سے گزر کر ان رسیلی اور لجائی ہوئی آنکھوں کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ جن میں میرے پُرجوش پیغامِ محبت کا جواب پوشیدہ تھا۔

والدہ نے کروٹ بدلی۔ اور بہو کو سو جانے کی تاکید کر کے محوِ خواب ہو گئیں۔

کھڑکیاں بند تھیں۔ سرد ہوا سے بچنے کے لئے میں نے اپنے مقابل کی کھڑکی بھی بند کر دی۔ میری پلکوں پر غنودگی کا ہلکا سا بوجھ تھا۔ میں نے اخبار اٹھایا اور گدیلے سے ٹیک لگا کر لیٹے لیٹے پڑھنے لگا۔

شاید گاڑی بہت ہی تیز جا رہی تھی۔ اتنی تیز کہ اس کی حشر انگیز گڑگڑاہٹ کے تسلسل نے سکون کی صورت اختیار کر لی تھی۔ یکایک مجھے معلوم ہوا کہ بجلی کی تیز روشنی مدھم ہو رہی ہے۔ میں نے اپنے اردگرد نگاہ ڈالی۔

والد کی نفیر خواب بلند تھی۔ والدہ پر بھی نیند کی بے ہوشی طاری تھی شاید میری دلہن بھی بیٹھے بیٹھے سو گئی تھی۔ کیونکہ اس کا گھونگٹ جو تھوڑی دیر پیشتر اس کے معصوم چہرے کو چھپائے ہوئے تھا۔ اب اپنے فرض سے کسی قدر غافل ہو گیا تھا۔ میں کھڑکی کے شیشے سے باہر جھانکنے لگا۔ آسمان پر کہیں کہیں بادل تھے۔ اور ایک سیاہ کملی کے ٹکڑے نے چاند کو لپیٹ لیا تھا۔

ریل گنجان جنگل سے گذر رہی تھی۔ درختوں کے جھرمٹ دیوؤں کے لشکر کی چھاؤنی معلوم ہو رہے تھے۔

دفعتاً میں اچھل پڑا ———

آہٹ ———

مجھے ایک ہیبت ناک آہٹ اپنی گاڑی کے خانے کے اندر محسوس ہوئی۔

میں نے مڑ کر دیکھا۔ دو آدمی سامنے کی کھڑکی کھول کر چلتی گاڑی میں سوار ہو گئے تھے۔ ان کی صورتیں خوفناک تھیں۔ ان کی آنکھوں میں خون تھا ان کے ہاتھوں میں چھرے تھے۔

کسی نے چپکے سے میرے کان میں کہا "ڈاکو" اور میرا دل اچھل کر گلے میں آ رہا۔ میرے پاس کوئی ہتھیار نہ تھا۔

ڈاکو۔ ہاں ڈاکو تھے۔ ان میں سے ایک نے سامان اوپر کے تختے سے اتار اتار کر گاڑی کے نیچے پھینکنا شروع کر دیا۔ اور دوسرا بیباکی سے میری بیوی کی طرف بڑھا۔

تعجب اور خوف نے مجھ پر غلبہ پا لیا۔ میرا سانس زور زور سے چلنے لگا۔ میں اس غیر متوقع خطرے سے سہم گیا۔ اچانک دلہن کی چیخ نے میری غیرت کو بیدار کر دیا۔ میں اٹھ کر جھپٹا۔ اپنے محوِ خواب والدین کی نشستوں کو پھلانگ گیا۔

ڈاکو نے میری بیوی کے منہ پر ہاتھ رکھ کر دوسرے ہاتھ سے چھرا اٹھایا ہی تھا۔ کہ میں بجلی کی طرح جا پڑا۔ اس سے چھرا چھین کر پھینک دیا۔

نہ جانے کیوں میرے منہ سے کوئی آواز نہ نکلی۔ ہم دونوں میں کشمکش شروع ہوئی۔ لیکن دوسرے ڈاکو نے میری کلائی اس زور سے پکڑی کہ میں تھوڑی دیر کے لئے مغلوب ہو گیا۔ اور ہانپنے لگا۔

دلہن بیہوش ہو گئی تھی۔ پہلا ڈاکو جو اب میری گرفت سے آزاد ہو چکا تھا۔ اس کی جڑاؤ بالیاں کانوں سے نوچنے لگا۔

دنیا میری آنکھوں میں اندھیر ہو گئی۔ میں ڈاکو کی گرفت سے شعلہ جوالہ کی طرح نکلا۔ اور دوسرے ڈاکو پر جا پڑا۔ ہم فرش پر گر پڑے۔ میں نے اس کی گردن دبوچ لی ——— اور اس زور سے دبائی۔ کہ اس کی آنکھیں باہر نکل آئیں۔ ان کی روشنی مدھم ہو کر رہ گئی۔ پسینہ میری پیشانی سے ٹپکنے لگا۔ میں بے دم ہو گیا۔

لیکن دوسرا ڈاکو ——— آہ میں اسے بھول گیا تھا۔ میں نے گھبرا کر نظر اٹھائی ———

اف میں نے ایسا روح فرسا واقعہ دیکھا جس نے میری رگوں میں خون

جما دیا۔

اُس نے میری بیوی کو دونوں ہاتھوں میں گٹھڑی کی طرح اُٹھا لیا تھا۔ اور کھڑکی کے قریب پہنچ چکا تھا۔

بے اختیار ایک چیخ میرے مُنہ سے نکلی۔

چشم زدن میں اس نے میری دُلہن کو گاڑی سے نیچے پھینک دیا۔ اور میرے اُٹھتے اُٹھتے خود بھی چلتی گاڑی سے کود کر غائب ہو گیا۔

میں دیوانہ وار کھڑکی کی طرف جھپٹا۔ گاڑی بہت تیز جا رہی تھی۔ جنگل تاریک تھا۔ درخت دیو زاد ڈاکوؤں کی طرح سیاہ گٹھڑیاں سروں پر اُٹھائے بھاگتے معلوم ہوتے تھے۔ آسمان پر سیاہ بادلوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ اور ستارے اس ہیبت ناک نظارے کو دیکھ کر سہم گئے تھے۔ فضا دم بخود تھی۔

میں نے مُڑ کر گاڑی کے اندر ایک نگاہ ڈالی۔ میرے والدین بدستور سو رہے تھے۔ گویا کوئی واقعہ ہی نہیں گزرا۔ نشست کے نیچے ڈاکو کی لاش اپنی منحوس اور پتھرائی ہوئی آنکھوں سے مجھے گھور رہی تھی۔

میرے سینے سے ایک آہ دلدوز نکلی۔ کچھ سوچنے کا وقت نہ تھا۔ میں

برق رفتار گاڑی کے پائدان پر کھڑا ہو گیا۔ بدن کو تولا۔ چھلانگ ماری۔
مَیں ایک جھاڑی پر جا گرا تھا۔ کوئی چوٹ نہیں آئی نہ کوئی آواز
پیدا ہوئی۔ چشم زدن میں گاڑی میری آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔ مَیں اُٹھا
اور تیر کی طرح پیچھے کی طرف بھاگا۔

ہولناک جنگل، اندھیرا اور ہیبت ناک سنّاٹا۔

مَیں دیوانہ وار ریل کی پٹڑی کے کنارے دَوڑ رہا تھا اور
آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ خاردار جھاڑیوں
میں میرا لباس اُلجھ اُلجھ جاتا تھا۔ لیکن مَیں دوڑتا رہا ——— بے تحاشا
دوڑتا رہا۔

دم پھولا ہوا تھا۔ ٹانگیں جواب دے رہی تھیں۔ گر کوئی مجھے کھینچ
رہا تھا۔ نہیں جانتا تھا۔ کتنی دُور آ گیا۔ کہاں پہنچ گیا۔ میری گُم شدہ دولت
کہاں مردہ پڑی ہے۔ اس کا کیا حشر ہوا۔

اچانک میرے پاؤں کو کسی چیز سے ٹھوکر لگی۔ آن میں سر سے پاؤں
تک لرز کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ ٹھوکر کے ساتھ ہی کراہنے کی ایک ہلکی
سی آواز میرے کان میں آئی۔

چاند کے چہرے سے بادلوں کا نقاب سرک چکا تھا۔ اور اس اندوہناک روشنی میں میری دُلہن کا مرجھایا ہُوا چہرہ صاف نظر آرہا تھا۔

یہ میری نئی نویلی دُلہن تھی۔ جو عالمِ بیکسی میں ایک مظلومانہ انداز سے گھاس پر بے ہوش پڑی تھی۔ چہرے پر خون کے دھبّے تھے۔ لمبے سیاہ بال ایک جھاڑی میں اُلجھے ہوئے تھے۔

آہ یہ، وحشت ناک جنگل۔ یہ ہُو کا مقام۔ درندوں کا مسکن اور ایک ننھّی سی جان!

مَیں کانپ گیا۔ بے اختیار مَیں نے پہلی مرتبہ اس کا نام لے کر پکارا میری آواز جنگل کی اتھاہ خاموشی میں ڈوب گئی۔ کوئی جواب نہ ملا۔ مَیں نے جھک کر اس کے سینے پر ہاتھ رکھ دیا۔ امید کی لہر میرے دل میں تھرتھرائی اس کا سینہ متحرک تھا۔ مجھے معلوم ہو گیا زندہ ہے۔ اُلجھے ہوئے دوپٹے سے اس کے چہرے اور کانوں کا خون صاف کیا۔ مَیں نے دیکھا۔ اس کو زیادہ چوٹ نہیں آئی تھی۔ شاید جھاڑی میں گرنے کی وجہ سے اُس کی جان بچ گئی تھی۔ لیکن کانٹوں نے پھول سے رخساروں پر کچوکے لگا دئے تھے۔ سُرخ سُرخ نشان چاند کی روشنی میں ایسے معلوم ہوتے تھے گویا سفید گلاب پر

پہاڑی دھاریاں۔

آنکھیں نیم وا تھیں۔ لب کھلے ہوئے تھے۔ میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ میں نے اس کے اُلجھے ہوئے بال جھاڑی سے الگ کئے اس کشمکش میں ایک چڑیا پروں کو پھڑپھڑاتی ہوئی جھاڑی سے اُڑی۔ اور بیتابانہ میرے سر کے گرد چکر لگا کر تاریک سکوت میں غائب ہو گئی۔

اس کی پرواز سے میں چونک اُٹھا۔ خوف نے گھیر لیا۔ میری دلہن بے ہوش پڑی تھی۔ میں اس ہیبت ناک ویرانے میں اسے تنہا چھوڑ کر پانی کی تلاش میں نہ جا سکتا تھا۔

سوچنے کے لئے میں نے کبھی اس سے زیادہ اپنے دماغ پر زور نہیں دیا۔ لیکن معلوم نہ ہو سکا کس جگہ پر ہوں۔ بادل روشنی پر پھر قابو پا گئے۔ گیدڑوں کے شور و غل نے اس وحشت ناک مقام کو اور بھی بھیانک بنا دیا۔

میں نے ریلوے لائن کی طرف دیکھا۔ پھر آسمان پر ستارے ڈھونڈنے کو نظر ڈالی۔

معلوم نہ ہو سکا اسٹیشن کتنی دُور ہے۔ لیکن میں نے اپنی بیوی کو کندھوں پر لاد لیا۔

دماغ میں جذبات کا ایک طوفان تھا۔ میں اپنے حسین بوجھ کو اُٹھائے ریل کی پٹڑی پر چلا جا رہا تھا۔ اس امید میں کہ شاید کوئی اسٹیشن مل جائے اور اس کی جان بچ جائے۔

اگر یہ مر گئی!

آہ یہ خیال خوفناک تھا۔ دُنیا پھر میرے لئے مرجھا رہی تھی۔

"بیکار زندگی۔ صبح اُٹھ بیٹھنا۔ کھانا کھا لینا۔ پانی پی لینا۔ سو رہنا۔ نہیں اب یہ زندگی نہ ہو سکے گی۔

نہ جانے میں ان خیالات میں محو کب تک چلتا رہا۔ اک مرتبہ میری بیوی پھر کراہی۔ میں نے اسے پٹڑی پر لٹا دیا۔ لیکن وہ بدستور بیہوش تھی۔ میں نے چاروں طرف دیکھا۔ فضا اور زیادہ تاریک ہو گئی تھی۔ میں نے اُسے پھر اُٹھا لیا۔ اور باد و باراں کے خوف سے چلتا گیا۔ چلتا گیا۔

پٹڑی کے دونوں طرف جھاڑیاں ہوا سے ہلنے لگیں۔ آسمان پر بادل اُمڈ اُمڈ کر آ گئے۔ بجلی چمکنے لگی۔ وہم ہزار ہا قسم کی صورتیں میرے سامنے پیش کرنے لگا۔ گیدڑوں کی چیخ و پکار اور درندوں کے خوف نے میرے خون کو منجمد کر دیا تھا۔ میں بے تحاشا بھاگ رہا تھا۔

اگرچہ تکان نے مجھے نیم مردہ بنا دیا تھا۔ لیکن فرض کا احساس، محبّت کا جذبہ اور شاید جان کا خوف مجھے اُڑائے لیے جاتا تھا۔ تند ہوا کا جھکڑ درختوں کو اکھاڑے ڈالتا تھا فطرت نے میری امیدوں کے خلاف سازش کر لی تھی۔ اب مینہ اور مینہ کے ساتھ اولے پڑنے شروع ہو گئے۔ اور قریب تھا کہ میں مایوس ہو کر گر پڑوں۔

مَیں نے اپنی مجبور اور عاجز نظریں پٹڑی پر دُور تک دوڑائیں۔ مجھے دُور سے سگنل کا سُرخ لیمپ چمکتا دکھائی دیا۔ میرے قدم اور بھی تیز ہو گئے۔

سردی سے ٹھٹھرتا ہوا پانی میں شور بور، اپنی دولت کو اٹھائے ہوئے میں اس چھوٹے سے اسٹیشن کے ذلیل مسافر خانے میں داخل ہو گیا۔ جہاں صرف ایک لالٹین جل رہی تھی۔ مجھے کسی متنفس کے سانس تک کی آواز کسی طرف سے سنائی نہ دی۔ شاید یہاں رات کے وقت کوئی گاڑی نہ ٹھہرتی تھی۔ اسٹیشن ماسٹر کا کمرہ اندر سے بند تھا۔ وہ سو رہا ہو گا۔ باہر مینہ اور اولے پڑ رہے تھے۔ مَیں نے بیوی کو ایک بنچ پر لٹا دیا۔ اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

خشک گھاس کا ایک ڈھیر مسافر خانے کے کونے میں پڑا تھا۔ اُس کی موجودگی کو خوش قسمتی سمجھا۔ اُسے اُٹھایا اور بنچ کے قریب فرش پر جمع کر دیا۔

پھر لالٹین میں سے بتی نکالی۔ اور بڑی مشکل سے ہوا کے جھونکوں سے بچاتا ہُوا اسے گھاس کے پاس لے آیا۔ اور آگ لگادی۔

خاطر خواہ اثر ہُوا۔ دُلہن کے سفید چہرے پر تشنج کے جو آثار پیدا ہو گئے تھے۔ دُور ہونے لگے۔

مَیں نے مسافر خانے کے گھڑے سے پانی کا ایک چلّو لے کر اس کے حلق میں چند قطرے ٹپکائے۔ اور اُس کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنے لگا۔

ایسا معلوم ہوتا تھا۔ اس وقت خلا میں معلّق ہوں شعلوں کی روشنی میں اس کے سفید زخمی چہرے پر رنگ آتے جاتے معلوم ہوتے تھے۔ اور میں امید و بیم کی تصویر بنا ہُوا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

بادو باراں نے طوفان برپا کر رکھا تھا۔ ہوا فراٹے بھر رہی تھی۔ آگ کے شعلے کبھی اِدھر کبھی اُدھر لپکتے تھے۔ جنگل کے درخت سائیں سائیں کر رہے تھے لیکن مجھے معلوم ہوتا تھا۔ دُنیا سکوت میں غرق ہو گئی ہے۔ میرا سانس بھی تھکا ہُوا چل رہا تھا۔

"آہ میری دُلہن! ابھی تُو گھر بھی نہ پہنچی۔ بات بھی نہ کی۔ آہ شادی تیرے

لئے مصیبت کا پیغام ہو گئی۔"

جوشِ گریہ سے میرا گلا بھر آیا تھا۔ زبان خاموش تھی۔ مگر میرا رواں رواں اس کی سلامتی کی دعائیں مانگنے لگا۔

میرے کلیجے میں ایک گداز آمیز درد اُٹھ رہا تھا۔ کیونکہ وہ ابھی تک بیہوش تھی۔ مَیں نے اس کے حنا مالیدہ ہاتھ جن پر چھلّوں اور پہنچیوں کو بے رحمی سے اتارنے کے باعث چرکے لگے ہوئے تھے۔ اپنے ہاتھ میں لے کر ملنے شروع کئے۔

ایک بار پھر وہ ہلکے سے کراہی۔ مَیں ہمہ تن چشم بن کر اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ اب وہ آنکھیں کھول رہی تھی۔ مَیں نے اسے نام لے کر پکارا۔ اس نے میری آواز سُن لی۔ نیم وا آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ شرم کی سُرخی نے اس کے چہرے پر ہلکا سا غازہ مل دیا۔

وہ اپنا ہاتھ میرے ہاتھ سے چھڑا کر آہستگی سے سر کی طرف لے گئی۔ شاید وہ گھونگٹ نکالنا چاہتی تھی۔ میرے منہ سے نکلا: شرم نہ کرو۔ تمہاری طبیعت کیسی ہے۔

اُس نے حیرانی سے آگ اور مسافر خانے کی دیواروں کی جانب دیکھا

شاید خوف پھر اس کے دماغ پر مسلط ہو گیا۔ اُس نے جھک کر دونوں ہاتھوں سے میرا بازو پکڑ لیا۔ آنکھیں بند کر لیں۔ کانپ رہی تھی۔

مَیں نے تسلّی دینے والے لہجے میں کہا: "تم بالکل سلامت ہو۔ اب کوئی خطرہ نہیں۔ دیکھو مَیں تمہارے پاس موجود ہوں۔ کیا تم میں اُٹھنے کی ہمّت نہیں۔ تمہارے کپڑے بھیگ رہے ہیں!"

یہ کہہ کر مَیں اُسے اُٹھانے لگا۔ وہ کراہتی ہوئی اُٹھ بیٹھی۔ لجا کر میرے آغوش سے علیٰحدہ ہو گئی۔ اور شرمائی ہوئی نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگی۔ اس نے بولنے کی کوشش کی۔ لیکن کسی خیال سے اس کی آنکھیں جھک گئیں۔ ہونٹوں پہ ہلکا سا تبسّم آیا۔

اُس نے پوچھا،

"ہم کہاں ہیں؟"

مَیں اُسے جواب بھی نہ دینے پایا تھا۔ کہ یکلخت ایک زور کا دھماکا ہُوا۔ میری بیوی کے لبوں سے ایک خوفناک چیخ نکلی۔ ایک ہیبت ناک روشنی سے میری آنکھیں بند ہو گئیں۔ اور ایک نامعلوم صدمے نے مجھے منہ کے بل گرا دیا۔

یہ بجلی تھی ——— !

میں جلدی سے اُٹھا۔ لیکن آہ۔ میری دُلہن کی جھلسی ہوئی لاش راکھ پر پڑی تھی۔ اس کے کپڑے ابھی تک سلگ رہے تھے ———

مَیں مُردے کی طرح سکتے کے عالم میں پڑا رہا۔ آخر ایک شخص کے جھنجھوڑنے سے مجھے ہوش آیا۔ وہ مجھے پکڑے ہوئے ادھر اُدھر گھسیٹ رہا تھا۔

مَیں تھوڑی دیر تک کچھ نہ سمجھا۔ لیکن رفتہ رفتہ تمام روح فرسا حقیقت مجھے یاد آگئی۔ اسٹیشن کے دو تین خلاصی یا کانٹے والے سیاہ کپڑے پہنے اور ایک بابو جو شاید اسٹیشن ماسٹر تھا۔ لالٹین پکڑے میرے گرد کھڑے تھے۔ میرے قریب ہی میری بیوی کی جلی ہوئی لاش پڑی تھی۔ اس کے اردگرد جھلسی ہوئی اینٹیں اور چونا پڑا تھا۔ مسافر خانے کی سنگین چھت میں شگاف نظر آرہا تھا۔

میرے جوڑ جوڑ میں درد تھا۔ شادی کے تمام کپڑے پھٹ گئے تھے بال اُلجھے ہوئے اور خاک آلودہ تھے۔ بابو نے مجھ سے پُوچھا۔ تم کون ہو جی!

یہ عورت کون تھی؟"

میں کچھ جواب نہ دے سکا۔ میری آنکھوں کے سوتے کھل گئے ایک خلاصی بولا۔

"دیکھا! وہ بجلی اسی عورت پر گری ہے۔ توبہ توبہ گنہگاروں کو دنیا ہی میں سزا مل جاتی ہے۔"

میں نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔ یہ لوگ مجھے کیا سمجھ رہے ہیں؟

میں بولا: "میں مصیبت زدہ ہوں۔ مجھے ڈاکوؤں نے لوٹ لیا ہے۔"

وہ سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ اسٹیشن ماسٹر نے کہا:

"تم اس عورت کو ایسی اندھیری رات میں کہاں سے بھگا کر لائے ہو۔ اس کا زیور کہاں ہے؟"

میں غضبناک ہوگیا۔ اس شخص کو ایک شریف آدمی کی مصیبت پر ہنسنے کا کیا حق تھا۔ میں نے ڈانٹ کر کہا: "بکواس نہ کرو۔ یہ میری بیوی ہے بمبئی میل میں ڈاکوؤں نے چلتی گاڑی سے گرا دیا تھا۔ میں اسے بچانے کے لیے گاڑی سے کود پڑا۔ اور اسے جنگل میں سے اٹھا کر یہاں لے آیا۔ یہاں اس پر بجلی گر گئی۔"

لیکن مجھے اِن لوگوں کے چہروں سے معلوم ہوا کہ میری کہانی کا انہیں یقین نہ آیا تھا۔

بابو نے خلاصیوں کو اشارہ کیا۔ وہ مجھے اُٹھانے لگے۔ بابو نے کہا "گاڑی ابھی آتی ہے۔ تمہیں پولیس کے سپرد کر دیا جائے گا۔ وہاں سب حال کھُل جائے گا۔"

مَیں نے کچھ جواب نہ دیا۔ اور نہ مزاحمت کی۔ اُنہوں نے مجھے بنچ پر بٹھا دیا۔ اور میری بیوی کی لاش بھی میرے پاس رکھ دی۔ ایک آدمی مجھ سے کچھ دُور ہٹ کر بیٹھ گیا۔

بارش تھم چکی تھی۔ اور دُھلے ہوئے آسمان پر ستارے چمک رہے تھے مَیں نے اپنے حواس فراہم کئے۔ اور اپنی موجودہ حالت پر غور کرنے لگا۔ آہ مجھے زندگی جہنم معلوم ہونے لگی۔

مَیں بہت جلد ایک فیصلے پر پہنچ گیا۔

گاڑی کی دھمک پلیٹ فارم کے بالکل نزدیک سنائی دی مَیں نے جھک کر اپنی دُلہن کے جلے ہوئے ہونٹوں کا پہلا اور آخری بوسہ لیا۔ اور ایک دیوانے کی طرح دوڑا۔ خلاصی چیختا ہوا میرے پیچھے بھاگا۔ انجن بالکل سامنے

آگیا تھا۔

خلاصی کے بازو نے میرے شانے کو جکڑ لیا۔ لیکن میں نے جست لگائی اور پٹڑی کے درمیان آگیا۔ اور انجن کی ٹکر سے میرا سر پاش پاش ......

میں نے یکایک بیدار ہو کر آنکھیں کھول دیں۔ والد میرا شانہ ہلا ہلا کر مجھے جگا رہے تھے۔

"اٹھو اٹھو اپنے شہر کا اسٹیشن آگیا"

اتنے میں گاڑی رکی۔ پلیٹ فارم پر میرے رشتہ دار اور دوست دولہا دلہن کے خیر مقدم کے لئے کھڑے تھے۔ باجے سے مبارک باد کی صدائیں نکل رہی تھیں۔ ہر طرف صبح صادق کا نور پھیلا ہوا تھا۔

میں نے تشویش سے کمرے میں ادھر ادھر دیکھا۔ والدہ دلہن کو برقعہ اڑھا رہی تھیں۔ دلہن کے زیوروں کی جھنکار اور ہنسی قہقہوں کے درمیان میں اٹھ بیٹھا۔

واقعی میں نے خوفناک خواب دیکھا تھا ؛

میں یادِ ماضی کے خونیں سیلاب میں بہتا پھرتا ہوں

ہوشیار دیوانہ

(۱)

"مَیں نے گناہ کیا!" یہ ایک خاموش صدا ہے جو میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ یہ ایک احساس ہے جو مدّت سے میری زندگی پر حاوی ہے اتنی مدّت سے جس کو میرے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔

دُنیا سکوت کی چادر اوڑھے بیخودی کی نیند سوتی ہے۔ مَیں بھی ایک فرسودہ رسم ادا کرنے کے لئے کسی بھڑبھونجے کے چھپّر میں بھٹی کے قریب یا کسی نانبائی کے تنور کے پاس ایک پرانی رضائی میں آنکھیں بند کئے سکڑا ہوا پڑا ہوں۔ بالکل چپ چاپ کا عالم ہے۔ لیکن نہیں ایک آواز میرے کانوں میں ناچتی ہوئی رُوح میں اُترتی چلی جاتی ہے "مَیں نے

گناہ کیا!" میں ایک جھرجھری لے کر اُٹھ بیٹھتا ہوں۔

دن کے وقت انسانی سمندر میں ایک طوفانِ عظیم بپا ہوتا ہے کشمکشِ حیات تازہ ترغیبوں کے جال بچھاتی ہے۔ ہوشیار دیوانے اپنے اپنے مشاغل کی بیخودی میں زندگی کا لطف بھول جاتے ہیں۔ اس غل غپاڑے میں جب میں کسی بندر نچانے والے یا کسی مقرر دوافروش کے تماشائیوں میں کھڑا قہقہوں کی بھیڑ بھاڑ میں اپنے حواس گم کر دیتا ہوں۔ تو یہی جانی پہچانی آواز مجھے صاف صاف سنائی دیتی ہے "میں نے گناہ کیا!" اور میں بھاگ جاتا ہوں۔

شام کے وقت بہتے ہوئے راوی کی ترنم ریز لہروں کے سامنے اُجلی ریت پر بیٹھ کر میں اکثر اپنی زندگی کی پیچ در پیچ تفصیلوں سے اُلجھ جاتا ہوں۔ اپنی پیدا کی ہوئی دنیائے خیال میں گم ہو جاتا ہوں۔ ماضی کی تیرہ و تار بھول بھلیاں میرے سامنے روشن ہو جاتی ہیں۔ میں یادِ ماضی کے خونیں سیلاب میں بہتا پھرتا ہوں۔ پھر جب اس سے نکلتا ہوں تو وہی صدا بے اختیار میرے منہ سے نکل جاتی ہے "میں نے گناہ کیا!"

"لیکن کیا میں اکیلا گنہگار ہوں؟"

یہ ایک استفسار ہے جو مجھے دوسری مرتبہ ماضی کی اتھاہ گہرائیوں میں لے جاتا ہے۔ کیا میں نے کوئی انوکھا کام کیا؟ کیا دوسرے مجھ سے کم گناہگار ہیں؟ کیا میں گناہ کے لئے مجبور نہیں کیا گیا؟

"بے آبروئی، شرم، بے عزتی، انتقام"

یہ الفاظ میرے کانوں میں گونج اُٹھتے ہیں۔

ہاں: "میں نے گناہ کیا۔"

لیکن اب یہ اعتراف احساسِ ندامت سے آلودہ نہیں ہوتا۔ نہ! بلکہ اب میرے خشک لب شرارت بھری مسکراہٹ سے ناچتے اور میری آنکھیں کامیاب شیطانی جذبے سے روشن ہو جاتی ہیں میرا چہرہ فاتحانہ خوشی سے چمک اُٹھتا ہے۔ اور میری روح میں ایک قسم کی تسکین پیدا ہو جاتی ہے۔ جس کے معنی میں خود نہیں جانتا۔

میں ایک لمبا سانس لیتا ہوں اور ریت پر چت لیٹ جاتا ہوں لیکن یہ سکون دیرپا نہیں ہوتا۔ اور پھر وہی بے معنی صدا میرے دماغ میں اُودھم مچانے لگتی ہے۔ "میں نے گناہ کیا؟" میں اُٹھتا ہوں اور جلد جلد شہر کی طرف واپس پلٹ آتا ہوں۔

(۲)

اس وقت میری عمر بتیس سال کی ہے۔ اگرچہ اپنے جھرّیوں سے بھرے ہوئے سُتے چہرے اور اپنی دھنسی ہوئی آنکھوں، نیم سفید اور پریشان بالوں۔ فرسودہ اور ناتواں جسم کے سبب سے چالیس برس کا ایک بدمعاش معلوم ہوتا ہوں۔ میرے چہرے پر ایک خوں خوار خرانٹ پن برستا ہے۔ میری کوئی عزت نہیں۔ دن بھر بازاروں، پارکوں اور گلیوں میں مارا مارا پھرتا ہوں۔ قہوہ خانوں، تفریح گاہوں میں ٹہلتا ہوں۔ یہاں جی نہیں بہلتا اُکتا جاتا ہوں۔ شہر سے دُور کھیتوں اور باغوں سے ہوتا ہوا دریا پر جا نکلتا ہوں۔ حتیٰ کہ اندھیرا ہو جاتا ہے۔ پھر نہ جانے کیوں بے سبب اپنی زندگی کو درندوں اور سردی کی دستبرد سے محفوظ رکھنے کے لئے ایک کشش بے اختیاری کے حکم میں شہر کی طرف واپس آتا ہوں۔

میں ابھی مرنا نہیں چاہتا۔ اور شاید اسی لئے صبح و شام کبھی نانبائی کی دھندلی دُکان میں سیاہ چٹائی پر بیٹھا نظر آتا ہوں۔ میری ضرورتیں بہت تھوڑی ہیں۔ میں نے مدت سے کپڑے نہیں بدلے۔ مجھے ان کی پروا بھی نہیں!

کیا شروع سے میری یہی حالت ہے ؟ نہیں میں نے بھی عیش کے دن گزارے ہیں۔ شہر کے اکثر لوگ مجھے جانتے ہیں۔ میں نے کئی ایک کو سرِراہ ٹھہر جاتے اور اپنی طرف تأسف سے نظر ڈالتے دیکھا ہے۔ ہاں وہ میری حالت پر افسوس کرتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ مجھے دیوانہ سمجھتے ہیں۔ میں لوگوں کے اس خیال پر مسکرا دیتا ہوں۔ کیونکہ اس مصنوعی دیوانگی نے میرے کاموں پر پردہ ڈال رکھا ہے۔ اپنا راز صرف میں جانتا ہوں۔ یا وہ ہستی جسے عالم الغیب کہتے ہیں۔ شاید اسی وجہ سے میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ مجھے موت کے خیال سے ہول آتا ہے۔ کیونکہ اگر خدا ہے اور عالم الغیب بھی ہے۔ تو اس دنیا میں جہاں معاملہ صرف اسی کی ذات سے تعلق رکھے گا۔ میرے لئے ڈرنے کے بہت سے سبب ہیں۔

لوگ مجھے دیوانہ سمجھتے ہیں۔ یہ بہت اچھی بات ہے۔ سمجھنے دو۔ جب تک وہ ایسا سمجھیں مجھے ان سے کوئی خوف نہیں۔

میرے متعلق عجیب و غریب کہانیاں مشہور ہیں۔ کوئی کہتا ہے، کثرتِ مطالعہ سے دماغ چل گیا ہے۔ کوئی کسی مجذوب کی صحبت کا اثر بتاتا ہے۔ کوئی کہتا ہے۔ یہ اپنی حسین بیوی کے گم ہو جانے سے حواس باختہ ہو گیا ہے

کوئی کہتا ہے بھائی کی موت نے دماغ ماؤف کر دیا ہے۔ اصل حقیقت سے کوئی واقف نہیں۔ میں دُنیا کی بیوقوفی پر ہنس دیتا ہوں۔ اور اپنی دیوانگی پر مضبوطی سے قائم ہوں۔

کیا بیوی کا گم ہو جانا یا بھائی کی موت کسی کو دیوانہ بنا دیتی ہے؟ مجھے معلوم نہیں۔ شاید ایسا بھی ہوتا ہو۔ لیکن مجھے تو یقین ہے۔ بھائیوں کی موت پر کسی کو پرِکاہ سے زیادہ رنج نہیں ہوتا۔ بیوی کی گُم شدگی اور دیوانگی! اوہو کتنا مضحکہ خیز خیال ہے!

میں بہت زیادہ محتاج نہیں ہوں۔ میرے پاس ایک رقم موجود ہے جسے میں آہستہ آہستہ خرچ کرتا ہوں۔ میرا ایک مکان بھی ہے۔ اگرچہ میں مدّت سے وہاں نہیں گیا۔ کیونکہ وہاں ایک بڈھا آدمی جو میرا باپ ہے۔ مجھے محبت سے آغوش میں لینے اور آنسو بہانے کے لئے آمادہ نظر آیا کرتا ہے میں اس کی کمزور اور حسرت بھری نگاہوں سے بچتا ہوں۔ گریز کرتا ہوں۔

مُدّت کا ذکر ہے کہ ایک دن راستے میں میری اس سے مڈ بھیڑ ہو گئی اُس نے مجھے زور سے پکڑ لیا۔ وہ اب بھی مجھ سے طاقت ور ہے وہ مجھے گھر کی طرف لے گیا۔ اُس گھر کی طرف جہاں میں پیدا ہوا تھا۔ جہاں

میری شادی ہوئی تھی۔ اور جہاں سے مَیں نکل بھاگا تھا۔ اُس نے میرے کپڑے بدلوائے۔ اور میرے سامنے بیٹھ گیا۔ وہ رویا۔ دیر تک رویا۔ اس نے کہا "تمہیں کیا ہو گیا میرے بیٹے! مَیں اب کس کے سہارے زندہ رہوں؟"

مجھے وہ وقت یاد ہے۔ مَیں کانپ گیا۔ میرے ضبط کی تمام قوتیں آنسوؤں میں تبدیل ہوتی معلوم ہوئیں۔ میرے لئے اپنی مصنوعی دیوانگی کو قائم رکھنا دشوار ہو گیا۔ لیکن مَیں نے اپنی کیفیات یا فطری کمزوری پر قابو پا لیا۔ زور سے ہنسا۔ پھر ایک کرسی اُٹھائی اور اُسے وحشیانہ انداز سے دیوار کے ساتھ آئینے پر دے مارا۔ آئینہ چکنا چور ہو گیا۔ میرے باپ نے مجھے پکڑ لیا۔ کیونکہ مَیں بھاگ جانا چاہتا تھا۔ وہ مجھے میرے کمرے میں لے گیا۔ اور باہر سے تالا لگا دیا۔ اُس کمرے میں جہاں میں نے اپنی زندگی کا بہترین حصّہ بسر کیا تھا۔

(۳)

مُدت کے بعد مَیں پھر اس کمرے میں تھا۔ میری خوشیوں کا مرکز، میری تمناؤں کا گہوارہ اور پھر میری عزّت میری آبرو کا مزار یہی کمرہ تھا۔ مَیں نے اسے دیکھا۔ دروازے کی چلمن اور روشن دان میں سے روشنی چھن چھن کر آ رہی

تھی۔ میں نے کمرے میں داخل ہونے کے بعد کوئی کشمکش نہ کی۔ یعنی اپنی اپنی دیوانگی کے اظہار کو بھول گیا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا۔ کہ میرا دل گلے میں اٹک گیا ہے۔ دیواروں پر میرے ہاتھوں کی لٹکائی ہوئی تصویریں میری طرف گھور رہی تھیں۔ میری اپنی شبیہہ جو کبھی ہنستی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اِس وقت نفرت آمیز غصّے سے میری طرف ٹکٹکی باندھے ہوئے تھی میں پلنگ پر بیٹھ گیا۔ سر جھکا لیا۔ باہر میرا باپ بلند آواز سے رو رہا تھا۔

"ہائے میرا بیٹا! میرے گھر کا چراغ! یا اللہ مجھ سے یہ دیوانگی دیکھی نہیں جاتی!"

مجھ پہ ندامت کا ایک بادل چھا گیا۔ میرے سینے سے ایک آہ نکلی: "میں نے گناہ کیا!" میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ گرم گرم تلخ تلخ! میں نے آنکھوں کو پونچھا۔ اور اپنی حالت پر تبصرہ کرنے لگا۔ "میں نے ایسا کیوں کیا؟" اس سوال نے بہت جلد میری مغلوبیت کو تندی میں تبدیل کر دیا۔ گذشتہ واقعات کی تلخ یاد نے میرے خون میں حرکت شروع کر دی۔ ایک دیو کی طرح میں اٹھا۔ اور اپنی تصویر دیوار سے اکھاڑ لی۔ اسے غور سے دیکھنے لگا۔

میری تصویر۔ یہ میں نے اُس وقت بنوائی تھی۔ جب میں شادی کے لیئے لباس بدل کر تیار ہوا تھا۔ میرا چہرہ ایک شریف اور تعلیم یافتہ نوجوان کا چہرہ تھا۔ میرے خیالات مجھے اس محفل میں لے گئے۔ جہاں ایک عورت کی قسمت میری قسمت سے وابستہ کر دی گئی تھی۔ میں اس وقت کیسا خوش تھا! میں اپنی دلہن کو اسی کمرے میں لے آیا تھا۔ بھولی بھالی ننھی منی دلہن کم از کم اس وقت میں اسے ایسا ہی سمجھا تھا۔ میرے پہلو میں تھی۔ میں اس پر ہزار جان سے شیدا تھا۔ ہماری شادی کو ایک سال گذر گیا میری محبت انتہائی بلندی پر پرواز کر رہی تھی۔ مگر۔ وہ۔ وہ عورت جو میری نفرت کا موضوع ہے۔ اور جس کے خیال سے میں غصے میں اس وقت بھی تھرا اُٹھتا ہوں۔ بیوفا تھی!

(۴)

میری آنکھوں سے شعلے برسنے لگے۔ میرے کان تمتما اُٹھے۔

”دغاباز۔ مکّار!“

میں نے اِن سے انتقام لے لیا! میرے منہ سے فتحمندانہ یہ فقرہ نکلا۔ میرے ہاتھ کسی خیالی اِنسان کا گلا گھونٹ رہے تھے۔ یہ میرے

اپنے حقیقی غدار بھائی کی خیالی لاش تھی۔ جسے میں نے سوتے میں مار ڈالا تھا۔ اس کی پتھرائی ہوئی آنکھیں اس وقت بھی مجھے بے بسی سے گھور رہی تھیں۔ مجھے وہ وقت بھی یاد آگیا۔ جب میں اور میرا باپ اس کی اچانک موت پر آنسو بہا رہے تھے۔ میرا بناوٹی رونا فلک شگاف تھا۔ کسی کو مجھ پر شک نہ ہوا تھا۔ ڈاکٹر نے اچانک دل کی حرکت بند ہو جانے کو موت کا باعث ٹھہرایا تھا۔

کیا میں نے اپنی بیوی کے سامنے شبہ کا اظہار کیا تھا؟ میں ایسا بیوقوف نہیں! میرا منصوبہ مکمل ہو چکا تھا۔ وہ اپنے راز سے بالکل مطمئن تھی۔ مجھے اس کے حال پر رحم بھی نہ آیا۔ اگرچہ وہ حاملہ تھی۔

ایک دن سرِ شام جب میرا باپ کہیں گیا ہوا تھا۔ میں اُسے سیر کرانے کے لئے دریا کی طرف لے گیا۔

ہم بالکل بے پروا سنسان اور غیر آباد کناروں کی طرف بڑھتے گئے۔ سُورج ڈوب رہا تھا۔ آسمان پر خون سوار تھا۔ دریا کا پانی بھی خون میں نہایا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ ہم گھاٹ سے ڈیڑھ میل دُور نکل آئے تھے۔ میری بیوی نے راز و نیاز کی باتوں کا جواب دینے میں کوئی ہچکچاہٹ ظاہر نہیں کی۔

پھر اچانک وہ ٹھٹک گئی۔ اور حیرت سے میرا مُنہ تکنے لگی۔ شاید اسے شک ہو گیا ہو۔ وہ آگے بڑھنے میں متامّل معلوم ہوتی تھی۔ اس نے کہا۔ "واپس چلنا چاہیئے۔" مَیں خاموش تھا۔ "چلو واپس چلو۔ اندھیرا ہو رہا ہے۔"

مَیں نے کچھ جواب نہ دیا۔

"تم چُپ کیوں ہو؟ مجھے ہَول آتا ہے۔"

یکایک مَیں نے اس کا بازو زور سے پکڑ لیا۔ میرے منہ سے پہلی مرتبہ وہ بات نکلی۔ جس نے اس کا رنگ فق کر دیا۔ وہ تھرائی اور میرے قدموں پر گر پڑی۔

معاف کر دو۔ مجھے معاف کر دو!"

میری آنکھیں ڈوبتے ہوئے سُورج کی طرح سُرخ ہو گئیں مَیں نے چھرا نکالا۔

"ہائے تم مجھے مار ڈالنا چاہتے ہو۔ نہیں نہیں۔ تم ایسا نہ کرو گے مجھے بخش دو۔ اس معصوم بچے کے لئے معاف کر دو۔ جو میرے پیٹ میں ہے!"

"ہرگز نہیں" جوشِ غضب میں میری آواز تھرتھرا رہی تھی۔ "تم بھی اسی کے پہلو میں جاؤ گی جس کو میرے ہاتھوں نے پیوندِ خاک کر دیا۔"

میری بیوی کا حسن زردی اور تاریکی میں تبدیل ہو گیا۔

"آہ تم نے ؟ کیا تم نے ؟"

"ہاں میں نے اس کا گلا گھونٹ دیا۔ وہ اسی قابل تھا۔ اور تم بھی اسی قابل ہو۔"

"میری بیوی نے ایک آہ کی۔ اور میری گرفت سے آزاد ہو کر بھاگنے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔ میں نے چاروں طرف نگاہ دوڑا کر چھرا اس کے سینے میں بھونک دیا۔ ایک دردناک چیخ کی آواز آئی۔ اور بس میں نے اسی پر اکتفا نہیں کی۔ بلکہ پے در پے میرا تیز چھرا اس کے نازک گوشت کو کاٹتا ٹکڑے ٹکڑے کرتا رہا۔ میرے انتقام کا جوش فرو نہ ہوتا تھا حتیٰ کہ میں نے گوشت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے دریا میں بہا دیے۔

ہہ ہاہا! وحشیانہ خوشی! آس پاس کی خاموشیاں میرے ساتھ ہلکے قہقہے لگا رہی تھیں۔

میں نے خون سے لتھڑی ہوئی تمام مٹی دریا میں ڈال دی۔

اپنے کپڑے پھاڑ پھاڑ کر بہا دئے۔ اور دوسرے پہن لئے جو ایک دن پیشتر وہیں چھپا دئے گئے تھے۔ اوہ۔ کس اطمینان کے ساتھ میں سیٹی بجاتا ہوا گھر واپس پلٹا۔ گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔ کسی نے مجھے نہ دیکھا نوکر چھٹی پر اور باپ دو دن کے لئے باہر گیا ہوا تھا۔ بلاشبہ میرا منصوبہ بڑی صفائی سے پورا ہو چکا تھا۔

(۵)

میں فرط مسرت سے اسی کمرے میں ناچ رہا تھا۔ "فاتح، کامیاب فاتح!"

میری خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ اب وہ نفرت انگیز ہستیاں کلی طور پر ناپید ہو چکی تھیں۔ میں نے دغا بازوں کو خوفناک سزا دی تھی۔ دریا برد۔ پیوند خاک! اب پھر یہ کمرہ میری تنہائی کا بہشت بن جائے گا۔"

یکایک میرے دماغ کا گودا جم کر رہ گیا۔ پہلی مرتبہ میری مسرت کا طلسم ٹوٹا۔ یہ ایک بھیانک چیخ کی صدا تھی۔ ننھے بچے کی چیخ۔

میرا رواں رواں کانپ گیا۔ میری بیوی میرے سامنے تھی۔ ایک ننھے معصوم کو دونوں ہاتھوں میں اٹھائے ہوئے لہو میں تر۔

مَیں بیہوش ہونے لگا۔ میرے مُنہ سے نکلا "مَیں نے گناہ کیا!"

مَیں نے دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھ لئے "یہ سب فضول ہے وہم۔ بالکل وہم۔ گنہگار روحیں مجھے کیا کہہ سکتی ہیں؟" مَیں کمرے سے نکل آیا۔ پھر مجھے اُس میں جانے کی جرأت نہ ہوئی۔

مَیں نے باپ کو تار دے کر بلایا۔ اُس نے پولیس میں میری بیوی کے بھاگ جانے کی رپورٹ لکھوائی۔ کوئی سراغ نہیں ملا۔ آج تک نہیں ملا۔ ـــــ مدّت کی دیوانگی کے بعد مَیں پھر اسی کمرے میں لایا گیا تھا ـــــ

پیچ در پیچ خیالات کے ہجوم نے مجھے گھیر لیا تھا۔ واہمے نے مرنے والوں کی صورتیں میرے سامنے لا رکھیں۔ جو جہنمی تبسّم سے مجھے دھمکیاں دے رہے تھے۔

مجھے اس کمرے سے نفرت ہے۔ سخت نفرت!

مَیں نے طیش میں اپنی تصویر ایک طرف کو دے ماری۔

"آہ" کا نعرہ بلند ہوا۔ یہ میرے ضعیف باپ کی صدا تھی۔ جو مجھے سوتا سمجھ اور دروازہ کھول کر دیکھنے کے لئے کمرے کے اندر آرہا تھا لیکن مَیں نے ٹھہر جانا ضروری نہیں سمجھا۔ مَیں نے پروانہ کی۔ مجھے کسی کی پرِوا

نہیں۔ میں پھلانگتا ہوا بھاگ نکلا۔

اب میں کبھی اس طرف نہیں جاتا۔ مجھے اپنے باپ کی صورت پر رحم آتا ہے۔ راستوں میں اُسے دیکھتا ہوں اور آنکھ بچا کر نکل جاتا ہوں۔ اس کی جھکی ہوئی غمدیدہ آنکھیں میرے ضمیر کی مُردہ قوتوں کو بیدار کر دیتی ہیں۔ اور میں پہروں اپنے گناہ کی یاد میں سرگریباں رہتا ہوں۔ لیکن مجھے پروا نہیں۔ کیونکہ میری دیوانگی کا راز مجھی تک محدود ہے۔ اور کم از کم اس دُنیا میں تو میں اسے افشا نہ کروں گا:

وہ تھک گیا اور ایک ٹھنڈا سانس اُس کے
کانپتے ہوئے ہونٹوں سے نکل گیا

خودکشی

مکتب سے گیارہ بجے چھٹی ہوئی میں حسبِ معمول گھر پہنچا خلافِ توقع میرا باپ اس وقت گھر میں بیٹھا حقہ پی رہا تھا میری ماں ایک طرف چپ چاپ بیٹھی تھی۔ اور گھر کا غمگین سکوت کہہ رہا تھا کہ آج پھر کوئی ناخوشگوار واقعہ ہؤا ہے۔

مَیں سہم گیا، کتابیں چارپائی پر رکھ دیں۔ والدہ کے زرد اور اُترے ہوئے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔

اس کی آنکھوں میں آنسو نہ تھے لیکن معلوم ہوتا تھا حد سے زیادہ رو چکی ہے۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ مَیں نے ڈرتے ڈرتے اپنے باپ کے چہرے پر نظر ڈالی۔ اس کی شعلہ بار نگاہیں مجھ پر گڑی ہوئی تھیں۔ اس کے درشت

بشرے سے طیش ٹپک رہا تھا۔

میرا سر خودبخود جھک گیا۔ اور میں چپ چاپ مُڑ کر آہستہ آہستہ اُن سیڑھیوں پر چڑھنے لگا۔ جو ہمارے مکان کی تیسری منزل کو جاتی تھیں۔ میرے پاؤں خوف سے کانپ رہے تھے۔ اسی وقت مجھے اپنے باپ کی گرج سنائی دی۔

"اِدھر کہاں چلا؟"

میری آگے بڑھنے کی قوت سلب ہو گئی۔ اور میں کچھ بولے بغیر نیچے اتر آیا اور گُم سُم کھڑا ہو گیا۔ میری ماں میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی فکر مند نگاہوں میں بے بسی کی جھلک تھی۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ شاید وہ کچھ کہتے ہوئے ڈرتی تھی۔ میرے باپ نے پھر کہا۔

"گُھنّے کھڑا دیکھتا کیا ہے۔ کھانا کھا لیا؟"

"کھا لیتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں جلد جلد باورچی خانے کی جانب چلا۔ میں نے چنگیر کو دیکھا۔ اس میں روٹی کے دو تین باسی ٹکڑوں کے سوا کچھ نہ تھا۔

"آج کچھ پکا نہیں۔"

طرح طرح کے وسوسوں سے میرا دل دھڑکنے لگا۔ میں نے دہی سوکھے

ٹکڑے اُٹھا لیئے اور دروازے کی طرف پشت کر کے کھانے کا بہانہ کر لیا۔
نہ جانے کیوں میں اپنے باپ سے یہ بات پوشیدہ رکھنا چاہتا کہ روٹی نہیں ہے۔

"اُٹھ کر اسے کھانا کیوں نہیں دیتی ——— سنتی ہے ——— میں کیا بک رہا ہوں۔"

میں نے بے اختیار مڑ کر جھانکا۔

روٹی صرف تمہارے لیئے پکائی گئی تھی۔

میں نے پہلی مرتبہ ماں کے چہرے پر خفیف سا غصّہ دیکھا۔ لیکن وہ بدستور خاموش ہو گئی۔

میرا باپ اُٹھ کھڑا ہوا اور یہ کہہ کر چلایا۔

"ابھی سے سوگ منا رکھا ہے۔ ابھی مر تو نہیں گیا۔

میں نے دیکھا۔ ماں ملامت آمیز نظروں سے میرے باپ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ بولی "نہیں مرا تو شام تک مر جائے گا۔"

یا اللہ یہ کیا معاملہ ہے؟ "کوئی میرے دل میں بیٹھا بیتابی سے کہہ رہا تھا۔

میرے باپ نے حقّے کی نَے نکالی اور میری ماں کو دھڑا دھڑ پیٹنا شروع کر دیا۔ قسموں اور گالیوں کے ساتھ ساتھ وہ کہتا جاتا تھا "میری بلا سے مر جائے۔ تم سب مر جاؤ۔ نکلو میرے گھر سے باہر جا کر مرو۔ تم نے میرا ستیاناس کر دیا۔"

مَیں ایک عجیب جوش سے لرز اُٹھا۔ سوکھا ٹکڑا میرے ہاتھ سے گر گیا۔ مَیں ابھی بچّہ تھا۔ صرف گیارہ سال کا بچّہ۔ لیکن مَیں جھپٹا۔ اُٹھ کر بھاگا اور اپنی ماں سے لپٹ کر گلے میں باہیں ڈال دیں۔ وہ اب بھی خاموش تھی۔ اور اس کی کنپٹی سے خون بہ رہا تھا۔ مَیں نے بچپن کی ملامت آمیز نگاہ سے باپ کی طرف دیکھا۔ میری بساط ہی کیا تھی۔ مگر میری اس ناگہانی جسارت سے وہ ششدر سا رہ گیا۔ اور سمجھ نہ سکا کیا کرے۔ اس کی غضبناک آنکھوں میں کھسیانے پن کی علامتیں پیدا ہو گئیں۔ اس کا ہاتھ رُک گیا۔ وہ میری طرف کچھ دیر تک خاموشی سے دیکھتا رہا۔ پھر حقّے کی نَے چھوڑ سیڑھیوں کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

"خبردار! اگر اُوپر گیا۔ تو کھال اُدھیڑ کر رکھ دوں گا۔"

اب وہ جلد جلد نیچے اُتر گیا۔ مَیں نے اُسے صحن سے گذرتے

دیکھا۔ جہاں میرا دادا اور میری سوتیلی ماں اور سوتیلا بھائی کھڑے مُسکرا مُسکرا کر سرگوشیاں کر رہے تھے۔ مَیں نے خیال کیا۔ وہ میری ماں کی اذیت سے خوش ہو رہے ہیں میری آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ مَیں نے اپنے بھائی کو یہ کہتے سُنا: "اس کی سزا ہی یہی ہے۔ یہ مرتی بھی نہیں فساد کی جڑ۔"

ماں نیم بیہوشی کی حالت میں پڑی تھی۔ مَیں برتن میں پانی لے آیا۔ اور اس کے رخساروں سے خون کے دھبّے دھوئے۔ اُس نے آنکھیں کھول دیں۔ مَیں نے پانی کا گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ اس نے دو تین گھونٹ پی لئے پہلے تھکی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی پھر اُٹھی اور آہستہ آہستہ تیسری منزل کی سیڑھیوں پر چڑھنے لگی۔ کسی نے میرے دل سے پوچھا "اوپر کیا ہے؟"

مَیں نہ رہ سکا۔ مَیں نے کہا "امّاں جان اُوپر نہ جاؤ۔ وہ پھر خفا ہونگے۔"

اُس نے مڑکر اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھی۔ اور آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے اپنے پیچھے پیچھے آنے کو کہا ——————

"شام تک مرجائے گا" یہ الفاظ ابھی تک فضا میں آوارہ تھے۔ مَیں بے اختیار ماں کے پیچھے پیچھے تیسری منزل پر چڑھ گیا اور وہاں کمرے میں داخل ہوا۔

مجھے ایک دھچکا سا لگا۔

ایک ٹوٹی پھوٹی چارپائی پر میرا چچیرا جوان بھائی مجید میری ماں کا بیٹا اس کے پہلے مرحوم شوہر کی یادگار، میرے باپ کا حقیقی یتیم بھتیجا اور داماد نیم بیہوشی کی حالت میں پڑا کراہ رہا تھا۔

(۲)

وہ خطرناک طور پر بیمار معلوم ہوتا تھا۔ اس کی نیم وا آنکھیں ڈراؤنی تھیں۔ اس کا سانس زور زور سے چل رہا تھا۔ اس کا رنگ جو کبھی سُرخ و سپید تھا۔ نیلا پڑ گیا تھا۔

ایک ہلکی سی چیخ میرے ہونٹوں سے نکل گئی۔ یہ میرا بھائی تھا۔ مجھے اس سے بے انتہا محبت تھی۔ وہ بھی گھر میں صرف مجھی سے محبت رکھتا تھا۔ اس نے مجھے ہاتھوں میں کھلایا تھا۔ وہ میرا گھوڑا بنا کرتا تھا۔ میں اس کی شادی پر شہ بالا بنا تھا۔ اس کی شادی کو تین سال گزر چکے —— لڑائی جھگڑے کے تین سال۔

اس کی بیوی میری سوتیلی بہن تھی۔ جس کو ہم تینوں سے نفرت کرنا سکھایا گیا تھا۔

"مجید کا باپ مر چکا تھا۔ جو میرا چچا تھا۔ مگر دادا زندہ تھا، جو میرا بھی دادا تھا۔

لیکن وہ بھی میرے باپ کی طرح اسے نفرت سے دیکھتا تھا کیونکہ مجید برسرِ روزگار نہ تھا۔

وہ بہت بیمار معلوم ہوتا تھا۔ اور والدہ جھک کر اس کی تپتی ہوئی پیشانی پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔

مَیں نے پوچھا "اماں جان بھائی جان کیوں بیمار ہیں"

ماں نے میرے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔

مَیں نے پھر پوچھا "اسے کیا ہوا ہے؟"

آنسو اس کے زرد رخساروں پر بہ نکلے۔ اُس نے آنچل سے آنکھیں پُونچھتے ہوئے گلوگیر آواز میں کہا۔

اس نے زہر کھا لیا ہے"

کسی نے مجھے دو قدم پیچھے دھکیل کر سائیں سائیں کرتے ہوئے اندھیرے میں چھوڑ دیا۔

"تم نے ابا کو کیوں نہیں بتایا۔ مَیں جاتا ہوں۔ واواجی کو خبر دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر مَیں بھاگ جانا چاہتا تھا۔ کہ ماں نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے روک دیا۔

"ان کو سب کچھ معلوم ہے۔ وہ اسے بہانہ سمجھتے ہیں۔ ان کو اس کی زندگی کی پروا نہیں۔ وہ خوش ہیں، سب خوش ہیں۔"

مجھے یاد آ گیا کہ ابا نے مجھے اوپر آنے سے روکا تھا۔ ایک زبردست غصّے کا احساس میرے سینے سے پیدا ہوا۔ میری نگاہ بھائی کے نیم مُردہ چہرے پر تھی۔ اور مجھے معلوم نہ تھا۔ مَیں کہاں کھڑا ہوں۔ مَیں نے والدہ کی آواز سُنی۔ "بیٹا۔"

مَیں نے اس کی طرف دیکھا۔

"یہ تیرا بھائی ہے .... بدنصیب۔"

میری چیخ نکل گئی۔ اور اگر والدہ کی نگاہ مجھے نہ روک دیتی تو شاید میں دھاڑیں مار مار کر رونے لگتا۔

"کیا تو کسی حکیم کو جانتا ہے؟"

مَیں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"بھاگ کر جا اور اُسے لے آ۔ ہاں اُسے لے آ۔ کہنا میرا بھائی بیمار ہے۔ زہر کا حال نہ بتانا۔"

میں جلد جلد سیڑھیوں سے اُتر کر صحن میں سے گزرا۔ والان میں میری سوتیلی ماں اور سوتیلی ہمشیرہ یعنی مجید کی بیوی آپس میں مسکرا مسکرا کر سرگوشیاں کر رہی تھیں۔

میں اندر ہی اندر لہو کا گھونٹ پی کر بھاگتا ہوا حکیم کے گھر کی طرف چلا۔ میرے کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا در و دیوار سے بین اور ماتم کی صدائیں آ رہی ہیں۔

گلی کے موڑ پر پہنچ کر میں حکیم کے گھر کی طرف مڑنا چاہتا تھا کہ پیچھے سے ایک آواز آئی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔

ہمارے محلہ کی ایک نوجوان لڑکی عزیزہ اپنے گھر کے کواڑ کی اوٹ سے سر نکالے نام لے کر مجھے پکار رہی تھی۔

میں نے چلّا کر کہا۔ "مجھے کام ہے۔" اُس نے زور زور سے بازو ہلا ہلا کر زیادہ اصرار کے ساتھ اشارہ کیا۔ میں بادلِ ناخواستہ واپس پلٹا۔ "وہ مجھے اپنی ڈیوڑھی میں لے گئی اور پوچھنے لگی:

"تمہارے بھائی کا کیا حال ہے؟"

مَیں نے تعجب سے اس کے حسین چہرے کی طرف دیکھا " وہ بیمار ہے۔"

"اس نے زہر کھا لیا ہے۔"

مَیں حیرت سے اُچھل پڑا " تمہیں کس نے بتایا؟"

"تم کسی کو بتاؤ گے تو نہیں؟"

کچھ سوچے اور یہ جانے بغیر کہ یہ کیا کہنے والی ہے۔ میرے منہ سے نکلا " نہیں۔"

اس نے ایک کاغذ نکالا اور مجھے دیدیا " اسے پڑھو"

یہ میرے بھائی کے لکھے ہوئے چند لفظ تھے ———

——— دادا جان نے منظور نہیں کیا۔ اب کوئی چارہ نہیں مَیں زہر کھا رہا ہوں۔ للہ مجھے معاف کر دینا۔

میری سمجھ میں کچھ نہ آیا " اس کا کیا مطلب ہے؟

"اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے نَو بجے سے پہلے زہر نہیں کھایا

تھا۔ ابھی اس کا بچ جانا ممکن ہے۔ تم کہاں جاتے ہو؟"

حکیم کو بلانے۔"

جلد جاؤ ——— یہ کہہ کر اُس نے کاغذ میرے ہاتھ سے لے لیا۔ اور پھاڑ ڈالا۔ مَیں حیران کھڑا اُس کا مُنہ تک رہا تھا۔ یکایک اُس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور التجا کے لہجے میں کہا ”بھیّا۔ تنہائی میں اگر تمہارے بھائی کو ہوش آئے۔ تو اُس کے کان میں میرا نام لے کر یہ کہہ دینا مَیں تیار ہوں ——— ضرور کہنا ——— کہو گے ——— مَیں ہاتھ جوڑتی ہوں ——— کسی اور سے ذکر نہ کرنا۔ لو اب آجاؤ۔"

دراصل مَیں کچھ بھی نہ سمجھا تھا۔ مَیں اس کے مغموم چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ اور چونکہ اس نے میرے بھائی کی بیماری میں ایک قسم کی ہمدردی ظاہر کی تھی۔ اِس لئے مَیں نے ایسا محسوس کیا گویا مَیں اُسے پسند کرتا ہوں۔

پھر مَیں حکیم کے گھر کی طرف بھاگ کھڑا ہؤا۔ بھاگتے بھاگتے مَیں نے مُڑ کر دیکھا تو وہ ابھی تک دروازے کی اوٹ سے جھانک رہی تھی۔ سُورج کی شعاعیں اس کے چہرے پر پڑ رہی تھیں۔ سفید اوڑھنی اوڑھے

وہ اس وقت فرشتہ معلوم ہو رہی تھی۔

(۳)

بوڑھے حکیم نے معائنے کے بعد پسینہ پونچھا اور کہا "اس نے کوئی زہریلی چیز کھائی ہے؟ زہر اثر کر گیا ہے۔ اگر فوراً تدبیر نہ کی گئی تو امید بہت کم ہے؟ یہ بے ہوش کب سے ہے؟"

والدہ نے پردے کے پیچھے سے کہا۔ ۹ بجے یہ باہر سے گھر آیا تھا۔ مجھ سے پانی کا گلاس لیا۔ اُوپر چلا آیا۔ ایک گھنٹہ بعد مَیں کسی کام کے لئے اُوپر آئی۔ یہ چارپائی پر تڑپ رہا تھا۔ اس کی ٹوپی اور تکیہ زمین پر پڑا تھا۔ جب مَیں نے تکیہ اُٹھایا۔ تو اس کی تہ میں مجھے یہ کاغذ ملا۔

مَیں نے والدہ کے ہاتھ سے کاغذ لے کر حکیم کو دیا۔ یہ اسی طرز کی تحریر تھی۔ جو مَیں نے عزیزہ کے پاس آدھ گھنٹہ ہوا دیکھی تھی۔

پیاری ماں۔

افیم کے ست کی گیارہ بوندیں۔ جو مَیں نے اپنے ہاتھ سے پانی میں حل کر کے پی ہیں۔ مجھے ہر روز کی بے عزّتی سے نجات دلا دیں گی۔ پیاری ماں تم فکر نہ کرنا۔ بھیّا کو میری طرف سے بہت بہت پیار

دینا. خدا کرے وہ تمہارے زخمی دل پر پھاہا رکھنے کے قابل ہو.

تمہارا بے نصیب یتیم

مجید

۹ بجے صبح مورخہ....

بوڑھے حکیم کے ہونٹوں سے ایک ہلکی سی آہ نکل گئی۔ اس نے یہ کہتے ہوئے کاغذ مجھے دیدیا۔ اب اس بات کا چرچا نہ ہونا چاہیئے. دوڑ دھوپ لازمی ہے. خدا مالک ہے."

یہ کہہ کر اس نے جیب سے ایک ڈبہ نکالا۔ اور اس میں سے خاکستری رنگ کا سفوف لے کر پانی کے گلاس میں حل کیا۔ اور "یا شافی" کہہ کر پہلے ایک ہاتھ سے مجید کے بھنچے ہوئے دانت کھولے پھر دوسرے سے گلاس کا پانی آہستہ آہستہ منہ میں ڈال دیا۔ میں نے بھائی کا چھنکتا ہوا سر پکڑ رکھا تھا۔ مگر میرے ہاتھ کانپ رہے تھے. میں دل ہی دل میں وہ دعائیں جو مجھے والدہ نے حفظ کرادی تھیں پڑھ رہا تھا۔

حکیم نے گھڑی دیکھی اور اسی سفوف کی تین پڑیاں بناتے ہوئے بولا "اگر دو گھنٹے کے اندر اندر اسے تین مرتبہ قے ہو گئی اور نہ مہر معدے

سے خارج ہو گیا۔ تو خدا سے امید رکھنی چاہیئے۔ پندرہ پندرہ منٹ کے بعد یہ دوائی پلاتے جاؤ۔ اللہ شافی ہے۔

یہ کہہ کر حکیم اُٹھ کھڑا ہوا۔

ماں نے کان سے سونے کی بالی اتاری اور پردے کے پیچھے سے ہاتھ بڑھا کر مجھے دیدی۔ اور کہا "نیچے جا کر تنہائی میں حکیم صاحب کو دیدینا اور ہاتھ باندھنا۔

آہ بیچاری اماں! اس کے پاس دوا کے لئے بھی روپیہ نہ تھا۔

میں حکیم کو لے کر نیچے اُترا۔ صحن میں دادا صاحب کھڑے تھے انہوں نے حکیم سے پوچھا "کیوں۔ کیا واقعی بیمار ہے؟"

جناب اس کے بچنے کی کوئی امید نہیں۔"

دادا کے مُنہ پر مردنی چھا گئی "یہ نامراد ہمیں اِس بڑھاپے میں پولیس کے شکنجے میں کسوائے گا۔"

حکیم نے حقارت سے لب سکیڑتے ہوئے جواب دیا "اب ذرا اس بات کو شہرت نہ دیجئے۔ ورنہ پولیس آدھمکے گی۔ اور سارا گھر ایک مصیبت میں مبتلا ہو جائے گا۔" یہ کہہ کر حکیم صاحب چل دئے۔

عزیزہ کے گھر کے قریب تنہائی تھی۔ وہاں میں نے حکیم کو بالی پیش کی اور کہا۔ کہ "اماں بہت غریب ہیں۔ ان کے پاس روپیہ نہیں"

"نہیں نہیں اس کی ضرورت نہیں۔ خدا تمہارے بھائی کو تندرست کر دے۔ بس یہی میرا معاوضہ ہے"

حکیم صاحب یہ کہہ ہی رہے تھے کہ کسی نے پیچھے سے آکر میرے ہاتھ سے بالی چھین لی۔ میں نے حیرت کے ساتھ مڑ کر دیکھا۔ تو یہ میرا سوتیلا بھائی تھا۔ جو نہایت شرارت آمیز نگاہوں سے حکیم صاحب کو تک رہا تھا۔

"تم کو یہ چیز لینے کا کیا حق ہے۔ یہ ہماری ملکیت ہے"

میں اور حکیم صاحب دونوں حیرت سے اُس کا منہ تکتے رہ گئے۔ اور وہ بالی لے کر بکتا جھکتا چلا گیا۔

حکیم صاحب نے شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔ کیا یہ تمہارا سوتیلا بھائی ہے؟"

میری آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ اسی وقت عزیزہ نے کواڑ کی اوٹ سے سر نکالا۔ "ہاں یہ سوتیلا بھائی ہے۔ سب کانٹے اسی کے

بوئے ہوئے ہیں۔"

حکیم نے معاذ اللہ کہتے ہوئے ادھر دیکھا۔ عزیزہ سفید آنچل سے منہ چھپائے ہوئے تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر دس روپیہ کا نوٹ چپکے سے ان کے ہاتھ میں رکھ دیا۔

"خدا کے لئے اسے بچا لو ——— یہ کہتے ہوئے اس نے جلدی سے کواڑ بند کر لئے۔

حکیم تعجّب سے نوٹ کو دیکھتے ہوئے بولا" یہ لڑکی کون ہے؟"

نہ جانے کیوں میرے منہ سے نکلا" میری بہن"

اچھا اچھا اب تم جاؤ۔ اور دوا کا خیال کرو۔ میں بھی ایک گھنٹے تک آجاؤں گا۔"

میں چپ چاپ گھر کی طرف پلٹا۔ عزیزہ کی صورت میری نظروں کے سامنے تھی۔" وہ کیوں اس قدر ہمدرد ہے؟ کیا وہ ہماری رشتہ دار ہے؟ مجید بھائی سے اسے کیوں دلچسپی ہے؟ اس نے دس روپیہ کا نوٹ کیوں دیا؟ اتنے میں میرے خیالات اپنے سوتیلے بھائی کی اس حرکت کی طرف منتقل ہو گئے۔ اور میری آنکھیں غصہ سے خون کبوتر

ہوگئیں۔ مَیں نے دل ہی دل میں اس کو بُرا سمجھنے کی قسم کھائی۔

(۴)

مَیں پھر مجید کے کمرے میں پہنچا۔ تو والدہ گلاس میں دوا حل کر رہی تھی۔ مَیں نے مستفسر نگاہوں سے اسے دیکھا۔ آہ وہ کتنی بدل گئی تھی۔ بے بس۔ بے کس۔ پُرسکون۔ صبر کی تصویر۔

"کیا اب تک کوئی قے نہیں ہوئی؟"

"کوئی نہیں" یہ کہہ کر اُس نے اشارہ کیا۔ مَیں نے بھائی کا منہ کھولا۔ والدہ نے حل کی ہوئی دوا چمچہ سے اس کے منہ میں ڈال دی۔

اب اس کے ساکت جسم میں حرکت شروع ہوئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے بے چینی بہت بڑھ گئی۔ مجید نے تڑپنا شروع کیا اور زور سے کراہنے لگا۔ اُس نے آنکھیں کھولنے اور اُٹھنے کی کوشش کی۔ مَیں نے اور والدہ نے مل کر اس کو بٹھایا۔ اُس نے زور سے اُچھل کر قے کی۔ میرا رؤاں رؤاں کانپ اُٹھا۔

طشت گہرے سیاہی مائل خون سے لبریز ہوگیا تھا۔ مَیں نے حیرت سے والدہ کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ بدستور پُرسکون تھا۔ ہونٹ آہستہ

آہستہ حرکت کر رہے تھے۔ شاید وہ دُعا پڑھ رہی تھی۔ پانی لے کر اُس نے مجید کا مُنہ صاف کیا۔ اور پھر لٹا دیا۔

وہ خُون سے بھرا ہوا طشت اُٹھا کر چلی۔ دروازے میں طشت اس کے ہاتھ سے گر پڑا۔

مَیں نے نظر اُٹھائی۔ میرا باپ، دادا اور سوتیلا بھائی سیڑھیوں پر چڑھ کر کمرے میں داخل ہو رہے تھے۔ خون کی چھینٹیں اُن کے کپڑوں پر پڑیں۔ میرے سوتیلے بھائی کے مُنہ سے کوئی سخت کلمہ نکلا۔ والدہ نے اس کی طرف ملتجیانہ دیکھا۔ وہ خاموش ہو گیا۔ بوڑھے دادا کے منہ سے نکلا "اندھی"

لیکن وہ رُک گیا۔ شاید اُس نے حالت کی اہمیّت کا اندازہ کر لیا تھا والدہ ایک کپڑے سے دہلیز اور زمین صاف کرنے لگی۔ اور وہ تینوں اندر آ گئے۔ مَیں نے اپنے دل میں غصّے کی ایک لہر اُٹھتی ہوئی محسوس کی۔ مگر میں خاموش رہا۔ مجھے محسوس ہوا کہ والدہ کی آنکھوں میں غم اور رحم کے جذبات جھلک رہے تھے۔ اور میرے سوتیلے بھائی کی آنکھوں میں شرارت کا تبسم۔

میرے باپ نے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔ "یہ تو سب سچ نکلا۔"

سفید داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دادا بولا "پھر اب کیا ہو سکتا ہے۔"

میرے باپ نے غصّے کی نظر سے دادا کی طرف دیکھا۔ آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ آپ نے اب تک مجھے اندھیرے میں رکھا جب شرع اجازت دیتی ہے۔ تو اس میں کیا قباحت تھی ——— صبح آپ ہی نے مجھ سے کہا تھا۔ یہ محض دھمکی ہے۔ پھر میرے سوتیلے بھائی کی طرف مخاطب ہوا۔ جاؤ ڈاکٹر تیرتھ رام کو لے آؤ۔ فوراً جاؤ۔"

وہ مُنہ ہی مُنہ میں کچھ بڑبڑاتا چلا گیا۔

سنگدل دادا بھی یہ کہتے ہوئے چلے گئے۔ "یہ پیدا ہوتے ہی مر جاتا تو بہتر تھا۔"

مَیں ان بزرگوں کی اس قاتلانہ روش پر حیران تھا۔ مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے میرے باپ کے دل پر سے پردہ سا اُٹھ گیا۔ اس وقت وہ شاید محسوس کر رہا تھا۔ کہ دادا بھی بزرگی اور کہن سالی کے باوجود خاندان کے ذلیل اور پست جھگڑوں میں بعض افراد سے دلی بغض و عناد کے جذبات رکھتا ہے۔

شاید اس کے دل میں خیال آیا۔ مَیں بھی تو اپنے بچے پر بارہا سختیاں

کر چکا ہوں۔ اگر باپ بیٹے پر ظلم کر سکتا ہے، تو دادا پوتے کا دشمن کیوں نہیں ہو سکتا۔ میں نے خیال کیا کہ میرے باپ کا دل حسرت و پشیمانی کے جذبات سے ٹوٹ رہا ہے۔

مجید نے آنکھیں کھولیں۔ ایک انگڑائی لی۔ میرے باپ نے شاید پہلی مرتبہ شفقت سے اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "کیوں مجید بیٹا ——— مجھ سے خوف نہ کرو ——— میں اب کچھ نہ کہوں گا جہاں تم کہتے ہو تمہاری شادی کروں گا۔ میں اپنی غلطیوں پر شرمندہ ہوں۔ میری آنکھوں پر پردے ڈال دیئے گئے تھے۔

اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ مجید کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پیدا ہوئی وہ بول نہیں سکتا تھا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر سینے پر رکھ لیا۔ اس کی آنکھوں سے دو آنسو بہ نکلے ———"

"بیٹا تم پر بہت سختیاں ہوئیں۔ معاف کر دو۔ اب تم اچھے ہو جاؤ گے۔"

مجید کے چہرے پر پھر بے چینی کی علامات پیدا ہوئیں۔ اور وہ زور سے تڑپا۔ میں نے اور والدہ نے سہارا دے کر اٹھایا۔ دوبارہ قے ہوئی اور زمین پر رکھا ہوا طشت پھر خون سے بھر گیا۔ پھر اس پر بیہوشی طاری ہو گئی۔

اس کا رنگ جو سیاہ ہو گیا تھا۔ اب سبز ہو کر ہلدی کی طرح پیلا پڑ گیا۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے نمودار ہو گئے۔

میرے باپ کی مایوس نگاہیں جھک گئیں۔ والدہ طشت اٹھا کر باہر صاف کرنے لے گئیں۔ مَیں نے دوا کی پڑیا گلاس میں ڈالی۔ تھرّاتے ہوئے ہاتھوں سے اس کو ہلایا اور باپ سے کہا۔

ابّا ڈاکٹر کی طرف آپ خود کیوں نہیں جاتے۔ بھیّا کبھی نہ جائینگے۔ اُنھوں نے میرے ہاتھ سے بالی چھین لی تھی۔"

"کونسی بالی؟"

مَیں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔" اماں کی سونے کی بالی جو مَیں حکیم کو دے رہا تھا۔ اس نے مجھے اور حکیم کو گالیاں بھی دی تھیں۔"

میرے باپ نے غمناک انداز سے سر جھکا لیا۔" یہ سب میری بیوقوفیوں کا نتیجہ ہے۔ مَیں جاتا ہوں۔ اور خود ڈاکٹر کو لے کر آتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

میرے دل سے ایک آواز اُٹھی۔"اس کا دل اتنا بُرا نہیں ہے۔"

اس وقت کمرے میں میرے اور مریض کے سوا کوئی نہ تھا۔ اچانک مجید کو پھر ہوش آنے لگا۔ اور اُس نے آنکھیں کھولیں۔ مجھے عزیزہ کا پیغام یاد آگیا۔ اگرچہ مَیں اس کا مطلب پوری طرح نہیں سمجھا تھا۔

مَیں نے کہا: "بھائی جان ہوش سنبھالو۔"

اُس نے میری طرف دیکھا۔ اُس کی بصارت کمزور نہ ہو گئی تھی۔

مَیں نے کہا: "عزیزہ۔"

مجید کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ مَیں نے پھر کہا: "عزیزہ کہتی تھی جس طرح تم کہو مَیں تیار ہوں۔"

مَیں نے دیکھا اس کے زرد چہرے پر ہلکی سی سُرخی آگئی۔ اس کے ہونٹ ہلے:

"کہہ —— دے۔ خو —— خوش —— مر گیا۔"

وہ تھک گیا اور ایک ٹھنڈا سانس اس کے کانپتے ہوئے ہونٹوں سے نکل گیا۔ مَیں نے کہا۔

"اور عزیزہ نے حکیم کو دس روپے دیئے تھے۔" اُس نے پھر بولنے کی کوشش کی۔ مگر بول نہ سکا۔ اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور

آہستہ آہستہ اسے ہونٹوں سے لگایا۔ اس کی شکر گزار آنکھیں میرے چہرے کو محبت سے تک رہی تھیں۔

والدہ پانی لے کر آگئی۔ میں عزیزہ کی باتوں میں دوا دینا بھول گیا تھا۔ والدہ نے مجید کو ہوش میں دیکھ کر کہا۔

—— "بیٹا مجید۔ کیوں۔"

اس کے لب مسکرائے۔ وہ بولنے کی کوشش کرنے لگا۔ ماں —— ا —— اللہ۔" اس کا ہاتھ ابھی تک میرے ہاتھ میں تھا۔ اس کی آنکھیں ماں کے چہرے پر تھیں۔ یکایک اس کے جسم میں ایک حرکت سی ہوئی۔ اور اس کا ہاتھ میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

—————— اماں نے اس کی آنکھیں دونوں ہاتھوں سے بند کر دیں۔

میں نے والدہ کے سفید اور خاموش چہرے پر نظر ڈالی۔

پھر کسی نے مجھے اندھیرے خلا میں پھینک دیا ؛

———

مجھے ایسا معلوم ہُوا۔ کہ سینے کے نہاں خانے میں کوئی جوان
عورت میری دلیل کے بودے پن پر مسکرا رہی ہے

آوارگی

(۱)

شام ہی سے آسمان پر سیاہ بادل گھرے ہوئے تھے جیسے جیسے وقت گزرتا گیا بازار کے چراغ ایک ایک کر کے خاموش ہوتے گئے۔ خوانچے والے تمباکو فروش، تنبولی نصف شب تک لہرا لہرا کر "گرما گرم چائے" کی صدا لگانے والے آج دس بجے ہی اپنے بچے کھچے سودے سمیٹ سمٹا گھروں کو جا چکے تھے۔ اکا دکا مسافر، بہکے ہوئے شرابی۔ آوارہ مزاج سیلانی تماش بینوں کے گروہ طوفان کی آمد آمد دیکھ کر اپنے اڈّوں کی خیر منا رہے تھے۔

میرے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہا۔ کہ آج معمول سے پیشتر اپنی ویران کوٹھری کی خیال آفریں تنہائی میں چلا جاؤں۔

سرائے جس میں بارہ بجے شب تک خاصی چہل پہل رہا کرتی تھی۔ آج سنسان نظر آتی تھی۔ مسافروں کی کوٹھڑیاں بند ہو چکی تھیں۔ بھٹیاریاں اپنی لڑائی دوسرے دن پر ملتوی کر کے قبل از وقت نیند کے آغوش میں خرّاٹے لے رہی تھیں۔ درختوں کی سائیں سائیں اور کتّوں کی چیخ پکار کے سوا کسی جاندار کی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔

مَیں اپنی کوٹھڑی کی ملول تاریکی میں چپ چاپ کھڑا تھا۔ باد و باراں کی آمد آمد میری رُوح پر ایک بار سا بن رہی تھی۔ شاید اس لئے کہ میرا تخیّل بھی طوفان کی چیرہ دستیوں سے پریشان ہو کر آج فضا میں مصروفِ پرواز نہ ہو سکتا تھا۔ اور تنگ و تاریک کوٹھڑی اور میرے مضمحل دماغ میں محدود رہنے پر مجبور تھا۔ میرے رُوئیں روئیں پر افسردگی ایک بوجھ کی طرح رکھی ہوئی تھی۔ سینے سے ایک لرزتا ہوا غبار اُٹھنا چاہتا تھا۔ مگر نہ اُٹھ سکتا تھا۔ مَیں رونا چاہتا تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو نہ تھے۔

مَیں نے دیا سلائی کی ڈبیا سے جس میں دن بھر کی سگرٹ نوشی کے سبب چند دیا سلائیاں باقی تھیں۔ ایک دیا سلائی جلائی اور موم بتّی کا ٹکڑا جو چارپائی کے داہنے پائے پر چسپاں تھا۔ روشن کر دیا۔ اور ایک چھچلیتی

ہوئی نگاہ اپنی کوٹھڑی اور اس کے سامان پر ڈالی۔

ایک فرسودہ چارپائی تھی جس پر نامکمل بستر تھا۔ دو کمل ایک تکیہ۔ چند پُرانے ادبی رسائل جو کباڑی کی دوکان سے خریدے گئے تھے۔ دو کتابیں۔

چارپائی کے دونوں طرف سینکڑوں سگرٹوں کے جلے ہوئے ٹکڑے، سوختہ دیاسلائیاں، سگرٹ کے خالی بکس۔ دو تین ملے دَلے کاغذ۔ جن پر میرے تازہ نتائجِ افکار یعنی وہ اشعار درج تھے جو نیند کو بلانے کے لئے مجھے ہر شب موزوں کرنے پڑتے تھے۔

تنگ کوٹھڑی کی دیواریں چونے گچ کی تھیں۔ ان میں جا بجا گرد سے اٹے ہوئے طاقچے۔ دیواروں کا رنگ کئی برس پیشتر شاید کسی خاص نام سے موسوم ہو سکتا ہو۔ لیکن اب پان کی پیک کے دھبّوں چراغ کے دُھوئیں بہے ہوئے تیل۔ اُکھڑے ہوئے پلستر نے مل کر اس کی رنگت کو بے شمار رنگوں کا ایک مؤثر مجموعہ بنا دیا تھا۔

ایک کونے میں میرا سفری ٹین کا لوٹا دھرا تھا۔ دیوار کے ساتھ ایک لکڑی کی کھونٹی پر میری گرم پتلون لٹک رہی تھی جس کا رنگ کثرتِ استعمال

سے خاکستری ہو چلا تھا۔ اور جو ایک مہینے سے استری کی گرم جوشی سے محروم تھی۔

کوٹھڑی کا فرش پختہ مگر اکثر جگہ سے اینٹیں اُکھڑی ہوئیں۔ جس پر مدّت سے جھاڑو نے عنایت نہ فرمائی تھی۔ اور اس لئے خاک کے چھوٹے چھوٹے تودے۔ کوڑا کرکٹ۔ مونگ پھلی کے چھلکے۔ اور دوسری ایسی ہی چیزوں کا فرش ہو رہا تھا۔

(۲)

"ہونہہ" کی ایک گلوگیر صدا میرے سینے سے نکلی۔ جو شرمندۂ لب نہ ہوئی۔ اور میرے چہرے پر زہر خندہ آ گیا۔ مَیں نے اپنا اوور کوٹ دونوں ہاتھوں سے اتارتے ہوئے اپنے کمرے اور اس کے سامان آرائش سے بے توجہی سی اختیار کر لی۔ اور کواڑ بند کر کے لباس کھونٹی کے سپرد کر دیا۔

"فل بوٹ" کو جو صبح سات بجے سے اس وقت تک میری آوارہ گردی کا معاون رہا تھا۔ چند گھنٹوں کے لئے رخصتِ آرام ملی۔ اور مَیں ریشم کے کیڑے کی طرح اپنے خول میں گھس گیا۔

"خول" اس لئے کہ پانچ راتوں سے بستر کو تہ کرنے یا از سرِ نو بچھانے

کی تکلیف گوارانہ کی گئی تھی۔ جس طرح صبح کو اس سے رخصت ہوتا رات کو پھر اس میں داخل ہو جاتا۔

موم بتی کی مدھم اور کانپتی ہوئی روشنی میں کمرے کی ہر ایک چیز بھیانک اور اداس نظر آتی تھی۔ میں نے ایک پرانا رسالہ اٹھایا اور روشنی کے رخ کروٹ لے کر لیٹے لیٹے کچھ دیر ورق گردانی کرتا رہا۔ میرا غیر دلچسپ مطالعہ نیند کے غیر معین وقت سے پیشتر کی گھڑیوں کو دلچسپ بنانے کا معمولی حیلہ تھا۔

کوئی عنوان کوئی مضمون ایسا نہ تھا۔ جو لکد کوبیٔ نگاہ سے بچ سکے مگر موم بتی کا ٹکڑا میرے تلوّن مطالعہ کی تاب نہ لا سکا۔ اور اس کی روشنی اپنی بساط کا آخری سنبھالا لے کر خاموش ہو گئی۔

میری آنکھیں کتاب کے صفحۂ تاریک پر کچھ دیر تک جمی رہیں۔ بالآخر احساسِ ظلمت سے مغلوب ہو کر میں نے تکیہ کے نیچے ہاتھ ڈالا۔ مگر مجھے یاد آگیا۔ کہ اکثر مرتبہ ارادہ کرنے کے باوجود میں اپنی فطری سہل انگاری کے سبب نئی موم بتیاں خریدنے سے آج بھی قاصر رہا تھا۔

میں نے ایک روکھی ہنسی ہنس کر کتاب کو ہاتھ سے رکھ دیا۔ اور

دونوں ہاتھ کمبلوں کے اندر کر لیے۔ اور نیند کے دیوتا کو دھوکا دینے کی ناکام کوشش شروع کی۔ باہر ہوا فراٹے بھر رہی تھی۔ اور چھپروں کے ٹین کھڑکنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

میرا دماغ ایک ایسی چکی کی طرح جو آٹا پیسنے کی بجائے دانوں کو جوں کا توں گرا دیتی ہے۔ گردشِ بے سود میں مصروف تھا۔ میرے غیر مسلسل خیالات ایک شکستہ جہاز کے تختوں کی طرح ماضی و حال کے طوفانی سمندروں میں غوطے کھا رہے تھے۔ ایک غیر معلوم خوف۔ ایک موہوم ہراس آہستہ آہستہ میرے قلب کی حرکت کو تیز کر رہا تھا۔

(۳)

آج مجھے گھر سے نکلے پورے اکیس دن ہو چکے تھے۔ وہ "گھر" جس میں میں نے اپنی زندگی کے تئیس سال خوشی اور ہر طرح کی بے پروائی میں بسر کیے تھے۔ اب صرف ایک دھندلا سا خیال بن کر باقی تھا۔ سیاہ بادل اسے گھیرے ہوئے تھے۔ اور اس پر حسرت کے آنسو بہا رہے تھے۔

"میں نے گھر کو چھوڑ دیا" یہ الفاظ میرے کانوں میں کوئی آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا۔ میں نے لیٹے لیٹے ایک گہرا سانس لیا۔ اور کوشش کی۔

کہ ماضی کی ناگوار یاد میرے حافظے سے محو ہو جائے۔

مگر ایک متوسط درجے کے مکان میں ایک معمر بزرگ کی مظلوم صورت بیکسانہ انداز سے مجھے گھور رہی تھی۔ اس کے آنسو اس کی سفید داڑھی کو ترکر رہے تھے۔

"آہ میرا باپ" وہ باپ جس نے اپنی زندگی کی تمام آسائش میری ترقی و بہبود کی امید کے ہاتھ فروخت کر رکھی تھی۔ جس نے مجھ پہ بھروسہ کرنے میں پدرانہ شفقت کے ساتھ قدرے سادہ لوحی کا ثبوت بھی دیا تھا۔

اس کی آنکھیں مجھے اس خاموش تاریکی میں ملامت سے گھور رہی تھیں۔ اور کالے کوسوں دُور میں اپنی "ماں" کے غمناک چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ عین اسی بے بسی کی حالت میں جس طرح سے مَیں نے اسے چھوڑا تھا۔

"افسوس ایک خوش باش گھرانا افلاس اور نکبت کی انتہائی پستی میں گرفتار تھا۔

شاید یہ میرے ہی ہونٹوں سے نکلا "خداوندا! صرف میری وجہ سے" یہ الفاظ اندھیری کوٹھڑی کی فضائے تاریک میں ایک سکوت افزا تھرتھراہٹ کے ساتھ گونجے۔ "نہیں یہ میرا قصور نہیں۔ مَیں اس سے

بری الذمہ ہوں۔ دونوں وہی دونوں میرے ماں اور باپ اس کے ذمّہ دار ہیں۔ انہوں نے میری تربیت میں بے پروائی سے کام لیا۔ مجھے کھُلے بندوں چھوڑ دیا ——————!

میرا سانس زور زور سے چل رہا تھا۔ سانس کی آواز ہوا کی چیخوں اور موسلا دھار بارش کے طوفان میں صاف سنائی دے رہی تھی۔

"تربیت میں بے پروائی۔" مجھے ایسا معلوم ہوا کہ سینے کے پوشیدہ جھروکے سے کوئی جوان عورت میری اس ذلیل کے بودے پن پہ مسکرا رہی ہے۔

میرا دل میرے حلق میں اٹک گیا اور میں نے بیٹھے لیٹے اپنا سر دادہ کانپتا ہوا ہاتھ آنکھوں پر پھیرا۔ گویا میں آنے والے خیال کی ملامت آمیز اذیّت سے بچنے کے لئے انتہائی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اپنی روح میں ایک بزدلانہ لرزش محسوس کی۔ "کیا میں اپنی بیوی کے تصوّر سے بھی تغافل اختیار کرنا چاہتا تھا؟"

ایک غمدیدہ بارِ الم سے دبی ہوئی نازنین کا حُسن افسردہ میرے روبرو تھا۔ جس کی آنکھیں اس اتھاہ تاریکی میں ایک ادائے مجبور سے میری طرف

نگراں تھیں۔ ان میں شکایت کے بجائے معصومیت اور رضا و تسلیم کے جذبات جھلک رہے تھے۔

میں ایک مجرم قیدی کی طرح اپنی بے بس بیوی کی خیالی مورت کے سامنے کانپ گیا۔ "ہاں یہ میری بیوی تھی۔" جس پر انتہائی ظلم ہوا تھا۔ "انتہائی ظلم خدا کی پناہ۔" ایک گلوگیر صدا بے اختیار میرے منہ سے نکل گئی۔

تین برس پورے تین برس میں نے اس کے صبر کا بہت کڑا امتحان لیا تھا۔

اس عالم خیال میں مجھے اپنی بیوی کی غمناک آنکھوں سے دو آنسو بہتے نظر آئے۔ میرا دل سینے کے اندر بیٹھ گیا۔ میرے دماغ کے سامنے گزشتہ واقعات متحرک تصاویر کی طرح سے گزرنے لگے۔

(۴)

میں نے دیکھا۔ کہ میں اپنی ذمہ داریوں سے بالکل بے پروا "تعیش" کے ذلیل راستے پر قدم زن ہوں۔ میرے خیالات مجھے پھر اسی صحبت میں لے گئے۔ جو میں نے باوجود متاہل ہونے کے اختیار کر رکھی تھی۔

"وہی شوق آزمامکان" جس کا دروازہ اس دولت کے لئے ہمیشہ

کھلاتا تھا۔ جو میں نے اپنے باپ سے حاصل کی تھی"۔ وہی عورت" جس کو مجھ سے زیادہ میری دولت سے عشق تھا۔ مصنوعی بناؤ سنگار کئے میرے لئے چشم براہ تھی۔ اس کے ہاتھوں، اس کے کانوں، اس کے سینے پر میری "بیوی" کے زیورات چمک رہے تھے۔ وہ زیورات جو میرے باپ نے میری شادی پر قرض لے کر بنوائے تھے۔" آہ ــــــ"

مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میری چارپائی زلزلے سے کانپ رہی ہے کیونکہ میرے سامنے یہی بے وفا عورت ایک دوسرے دولتمند "مرد" کے لئے بیتاب محبت نظر آرہی تھی۔ اس لئے کہ اب میرے باپ کا کل اثاثہ "میرے ہاتھوں" اس کی بے پناہ خواہش زر کی نذر ہو چکا تھا۔

اور میں سر جھکائے۔ ہارے ہوئے قمار باز کی طرح اس کے مکان سے نکل رہا تھا۔ میرے قدم اپنے افسردہ گھر کی طرف نہیں۔ جہاں والدین اور بیوی میری "تباہ حال" واپسی کے منتظر تھے۔ بلکہ پردیس اور مسافری کی طرف میری رہنمائی کر رہے تھے۔ میری شرم میرے گھر واپس جانے میں مانع تھی۔

اس مدہوشیٔ خیال کے عالم میں واقعاتِ گذشتہ کی حقیقت بجلی کی طرح میرے تاریک دماغ میں چمکی۔ وہ جانکاہ حقیقت جس نے میرے بوڑھے

والدین اور جوان بیوی کے لئے دنیا کی راحتوں کا خاتمہ کر دیا تھا۔

"مَیں نے کیا کیا" میرے دل میں افسوس اور ندامت کے حسیات ابھرے۔

"کیا مجھے گھر واپس جانا چاہیئے۔ نہیں مجھ میں ایسی جرأت نہیں! موقع گزر گیا۔ مجھے بھول جانا چاہیئے۔ کہ میرا کوئی گھر تھا۔"

ایک بار پھر ماں باپ کے حسرتناک چہرے میرے سامنے آ گئے۔ جن پر بڑھاپا اور ماندگی برس رہی تھی۔ آہ جن کو میں مفلس اور برباد چھوڑ کر آوارہ گردی کرنے نکل آیا تھا۔ اور جو صرف میری امیدوں کے سہارے زندہ تھے۔

پھر ایک بار میری بیوی کی غمزدہ آنکھیں میری طرف بے بسی سے تک رہی تھیں۔ اس کی مسرور گھڑیاں صرف میرے دم سے وابستہ تھیں۔ اس نے اپنی تمام جوانی میرے تغافل کی نذر کر دی تھی۔

آگ کی طرح جلتے ہوئے آنسو میری آنکھوں سے بہہ نکلے۔ میں رویا۔ میرا حلق خشک ہو گیا۔

میری ذلیل کوٹھڑی سے باہر سرائے کے کشادہ صحن میں ہوا اور پانی

میں زور آزمائی ہو رہی تھی۔ درختوں میں ہوا چیخیں مار رہی تھی۔ بجلی تڑپ رہی تھی۔ بادل گرج رہے تھے۔ طوفان نے ایک طوفان قیامت برپا کر رکھا تھا۔

یک لخت میری تمام رُوح کا بوجھ آنسو بن گیا۔ اور میں پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگا۔

(۵)

صبح کو بادل چھٹ چکے تھے۔ اور سرد ہوا کے لطیف جھونکے آہستہ آہستہ سرسرا رہے تھے۔ سُورج اُفق پہ نیا نیا نظر آ رہا تھا۔ اور معلوم ہوتا تھا۔ کہ سحر کسی عظیم راز کا انکشاف کر رہی ہے۔ اس وقت میرا دل رُک رُک کر اور خوشی سے دھڑک رہا تھا۔

اور جب صبح کی روشنی میری تاریک کوٹھڑی میں حیاتِ تازہ کا پیغام لائی۔ تو میں اپنا اسباب باندھ چکا تھا۔ اور اپنے چھُوٹے ہوئے گھر اور بچھڑے ہوئے عزیزوں کے پاس جانے کو تیار تھا۔

وہ اس اجنبی کے سامنے کچھ جھینپی ہوئی اور
اور غیر معمولی طور پر خاموش معلوم ہوتی تھی

ملمّع

(۱)

خوب صورت تارا دیکھنے والوں کو اٹھارہ سال کی جوان لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ مگر اس کی عمر سولہ برس سے بھی چند مہینے کم تھی۔ ایک ایسا شگفتہ پھول معلوم ہوتی تھی۔ جس کو کھلے کچھ زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ حسین تھی۔ مگر اس کو یہ خبر نہ تھی۔ کہ یہ حسن دلوں پہ بجلیاں بھی گرا سکتا ہے۔ الّہڑ، منٹھائی اور کھلونوں سے بہل جانے والی۔ بچّوں کی طرح کھیل کود کی شائق۔ وہ عام پارسی لڑکیوں کی طرح دیدہ دلیر اور چالاک نہ تھی۔ اس میں ملنساری اور بے تکلفی کا میلان قدرے زیادہ تھا۔

وہ ابھی ابھی سکول سے تعلیم حاصل کر کے نکلی تھی۔ اور اِس خوشی

میں اس کے دولتمند باپ مسٹر رستم جی نے اپنے چند بے تکلف دوستوں کو مختصر سی دعوت دی۔ اس دعوت میں نریمان بھی مدعو کیا گیا اور اس کا باپ بھی جو بمبئی کا کروڑپتی مہاجن تھا۔

کھانا کھانے کے دوران میں تارا مہمانوں سے نہایت بے تکلفی سے گفتگو کرتی رہی۔ اس کی گفتگو کا موضوع سکول کی دلچسپیاں ہمجولیوں کے تذکرے اور قدرتی مناظر کا ذکر تھا۔ مگر اس کی پیاری پیاری باتوں میں لطف یہ تھا کہ ہر چیز کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھینچ دیتی تھی۔

کھانے کے بعد اس نے پیانو بجایا۔ موسیقی کے اثر سے تمام مکان گونج اٹھا۔ ریشمی گلابی ساڑھی باندھے تارا اس وقت پری نظر آتی تھی۔

بس اسی دن سے نریمان کو معلوم ہو گیا کہ وہ تارا پر جان دیتا ہے فدا ہے۔ باتوں باتوں میں عشق اس کی ہستی پر حاوی ہو گیا۔ جوش و خروش کی حدوں سے گذر گیا۔ کمسن تارا کا بے پناہ حسن اس کے دل پر اثر کر گیا۔ وہ اس کی تقدیر کے فیصلے پر حاکم ہو گئی۔

رفتہ رفتہ اس کی آمد و رفت اس مکان میں بہت بڑھ گئی۔

تارا کے والدین نے بھی اس ارادے کو غیر مناسب نہیں سمجھا۔ اس

لئے کہ دولتمند ہونے کے علاوہ نریمان صورت و سیرت کے لحاظ سے بھی اپنے ہمعصر نوجوانوں میں ممتاز تھا۔ اکیس سال کی عمر میں اُس نے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کر لی تھی۔ اب دو سال سے اپنے باپ کے مہاجنی کاروبار میں شریک تھا۔

وہ ہر روز اپنی محبوبہ کے مکان پر حاضری دیتا۔ اور اس کے لئے پھول اور مٹھائی لے جاتا۔ وہ اکثر پائیں باغ کے ایک پھول سے بھرے ہوئے کنج میں بنچ پر بیٹھ کر تارا کو کوئی دلچسپ کتاب سناتا پیانو پر اس کا ہم آہنگ بنتا۔ وہ شام کے کھانے پر اس خاندان کی میز کا ایک ضروری رکن ہو گیا تھا۔

غرضکہ نریمان کی آرزوؤں کے بر آنے میں کوئی امر مانع نہ تھا۔ مگر اسے اپنی کم سن محبوبہ سے عرضِ مدعا کی جرأت نہ ہوتی تھی۔

شاید وہ عشق کے جذبات کو سمجھ نہ سکے۔ شاید اسے محبت کا مفہوم معلوم نہ ہو۔ شاید اسے معلوم نہ ہو کہ وہ کیا چاہتی ہے۔ شاید وہ اپنے میلان کا اندازہ نہ کر سکے۔

یہ خیالات اس کے بڑھے ہوئے جوش کو پسپا کر دیتے اور وہ اس

کے سامنے دوزانو ہوتے ہوتے رُک جاتا تھا۔ پھر وہ خیال کرتا ابھی جلدی کیا ہے۔ انتظار کا لطف چند روزہ ہے۔ وصال کے بعد امید و بیم کے لمحے ہوا ہو جائیں گے۔ وہ انتظار کی غم انگیز گھڑیوں میں ایک قسم کی لذّت محسوس کرتا تھا۔

مگر آخر کار عشق جنوں کے درجے تک پہنچ گیا۔ اس کی راتیں ہجومِ خیالات میں کروٹیں بدلتے گزر جاتی تھیں۔ وہ آدھی رات کو بسترِ استراحت سے اُٹھ کھڑا ہوتا اور اپنے حسین تخیّل میں ڈوبا ہوا کمرے میں اِدھر اُدھر ٹہلتا۔ حتیٰ کہ صبح ہو جاتی۔ وہ حروفِ مدعا کی ہزاروں صورتیں صفحۂ دل پر بناتا اور بگاڑ دیتا تھا۔

وفورِ شوق سے مجبور ہو کر ایک دن اس نے تارا کی والدہ سے تخلیہ میں ملاقات کی۔ وہ حسبِ توقع محبّت سے پیش آئیں۔ اور نہایت مسرّت سے اس کی درخواست منظور کر لی۔ اور اجازت دے دی کہ وہ جس وقت چاہے تارا سے اپنی تمنّا کا اظہار کر سکتا ہے۔

یہ موقع بھی اسے اسی شام حاصل ہو گیا۔ تارا اپنے کمرے میں ایک صوفے پر بیٹھی تھی۔ ثریا اس کے دونوں ہاتھ تھامے ہمہ تن گویائی

بنا ہوا تھا۔

پہلے پہل تو وہ کانپ سی گئی۔ شرم سے اُس کا چہرہ گلابی ہو گیا۔ پھر نہایت بھولے پن کے ساتھ حیرت سے نریماں کا منہ تکنے لگی۔ جب وہ اپنی بیتابی کا حال بیان کر چکا تو ہنس کر بولی۔ "تو کیا آپ واقعی مجھ سے بہت جلد شادی کرنا چاہتے ہیں"

"ہاں اگر تمہاری مرضی بھی ہو!"

تارا کچھ سوچنے لگی۔ نریمان امّید و بیم کی تصویر بن گیا۔ اس کی نبض تیز تیز چل رہی تھی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ دل میں ہزاروں وسوسے گزر رہے تھے۔ "کیا اس نے ابھی تک اپنے دل سے فیصلہ نہیں کیا۔ کیا اسے ابھی تک محبّت کا احساس نہیں ہوا۔ کیا میں جلد بازی کر رہا ہوں۔ کیا یہ میرے دل کی اصل حالت کو سمجھ بھی سکتی ہے؟"

لیکن یکلخت اس کے یہ خیالات مسرّتِ بے پایاں سے بدل گئے کیونکہ تارا کھلکھلا کر ہنسی اور دونوں ہاتھ نریماں کے شانوں پر رکھ دیئے۔ "ارے تم مجھے پیار کرتے ہو۔ تم بہت نیک ہو۔ ابّا جان تم کو نیک سمجھتے ہیں۔ امّاں جان بھی تمہاری لیاقت کی تعریف کرتی ہیں۔"

نرمیاں نے پوچھا۔ "کیا تم بھی ——"

"ہاں مَیں بھی تم کو بہت اچھا بہت نیک جانتی ہوں تم میرے لئے پھول لاتے ہو تم مجھے کہانیاں سناتے ہو۔ تم بہت اچھے ہو۔"

نرمیاں نے دل کڑا کرکے مکرر کہا: "کیا تم مجھ سے شادی کرنے کو تیار ہو؟"

تارا بولی: "اچھی بات ہے۔"

نرمیاں مسرت کی بیخودی میں غرق ہو گیا۔

(۲)

اس باہمی رضامندی کے بعد تارا کے والد نے ان دونوں کی منگنی کا اعلان کرنے کے لئے ایک پُرتکلف دعوت دینے کا سامان کیا اور دوستوں اور رشتہ داروں کو خطوط لکھے۔

دعوت سے ایک دن پیشتر نرمیاں کا ایک دوست جو کالج میں اس کا ہم جماعت تھا۔ اور بیرسٹری پاس کرنے ولایت چلا گیا تھا۔ واپس لوٹا۔ اس کا نام فرامرز تھا۔ پُونا کا رہنے والا تھا۔ ولایت کے دورانِ قیام میں اس کے باپ کا انتقال ہو گیا تھا۔ اور اب وہ بمبئی میں وکالت کرنے

کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس کے بُشرے سے غیر معمولی ذہانت کے آثار ہویدا تھے۔ وہ بہت خوبصورت تھا۔ اور اس کی آنکھوں میں ایک ایسا مقناطیسی اثر تھا۔ کہ جو اسے دیکھتا تھا اس کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔ زیبان کو اس کی دوستی پر حد سے زیادہ ناز تھا۔ دعوت کے روز وہ اسے بھی اپنی محبوبہ کے مکان پہ لے گیا۔ اور تارا کے خاندان کے لوگوں سے اس کا تعارف کرا دیا۔

دعوت بہت پُر تکلّف اور پُر لطف تھی۔ زیبان کی مسرّت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ کیونکہ مسٹر رستم جی نے مہمانوں کے سامنے اس کے ساتھ اپنی دختر کی نسبت کا اعلان کر دیا۔ اور تین ماہ بعد شادی کی تاریخ بھی مقرر کر دی۔

اس جلسہ میں فرامرز پر خاص نگاہیں پڑ رہی تھیں۔ اس کی گفتگو، اس کے معلومات جدیدہ، اس کے نظر فریب جمال کی وجہ سے ہر شخص اس سے بہت جلد مانوس ہو گیا۔ فرامرز کی بات بات سے ذہانت اور علمیت کا اظہار ہوتا تھا۔ مسٹر رستم جی تو اس کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ ملاقاتِ بازدید کے لئے اصرار کرنے لگے۔

کھانے کے بعد زیبان۔ فرامرز۔ تارا تینوں پائیں باغ میں سیر

کرنے لگے۔ گو کچھ زیادہ گفتگو نہیں ہوئی۔ کیونکہ تارا اس اجنبی کے سامنے کچھ جھینپی ہوئی غیر معمولی طور پہ کچھ خاموش معلوم ہوتی تھی۔ اور جب رخصت ہوتے وقت وہ زریان کے کوٹ میں گلاب کا پھول لگا رہی تھی۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ لیکن زریان اس کی دلفریب اداؤں میں محو تھا۔

دونوں دوست رخصت ہو کر گھر کی طرف چلے۔ راستے میں فرامرز نے تارا کی بہت تعریف کی۔ "آپ کی منسوبہ بالکل فرشتہ ہے۔ اس کے سراپا میں حُسن اور عصمت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ بیشک آپ خوش نصیب ہیں۔ میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔"

زریان نے اس کے جوشِ تعریف کا دل ہی دل میں شکریہ ادا کیا۔ اور گفتگو منگنی، شادی سے گزر کر تارا کے والدین کے تموّل اور وسعتِ جائداد اور مکانوں کی کثرت تک پہنچ گئی۔

اس وقت مسٹر فرامرز کو یاد آیا۔ کہ اسے اپنے دفتر وکالت کیلئے ایک مکان کی ضرورت ہے۔ زریان نے وعدہ کیا کہ وہ رستم جی سے دریافت کر کے اگر کوئی اچھا مکان خالی ہوا تو اسے دلوا دے گا۔

اب تارا کے گھر میں زریان ایک امتیازی شان رکھتا تھا۔ دوسرے

دن جب شام کے وقت تارا اور وہ باغ کے ایک گوشے میں بیٹھے تھے۔ زمیان وفورِ شوق سے راز و نیاز کی باتوں میں مشغول ہو گیا۔ لیکن اُس نے دیکھا۔ کہ اس کی منگیتر طولِ کلام سے اُکتا رہی ہے۔ وہ گرمجوشی اور تعجب سے پوچھنے لگا "کیا تم کچھ تھکی ہوئی ہو؟"

تارا دلفریب ادا سے مسکرائی۔ اس نے ایک انگڑائی لی "نہیں مجھے تمہاری باتوں سے ہَول آتا ہے۔ اِس طرح کی چاہت خوفناک ہے"

زمیان اس بھولے پن پر مسٹ گیا۔ اور اس نے گفتگو کو طول دینے کے لئے ہنس کر پوچھا "محبت سے ہَول۔ ہَول کیسا؟"

اس نے کچھ کھسیانی سی ہو کر آنکھیں جھکا لیں۔ اور پھر اپنی ساڑھی سر پر درست کرتے ہوئے بولی۔ "مَیں نے ایک کتاب میں پڑھا ہے۔ کہ عورتیں بھی مردوں سے بے انتہا محبت کرتی ہیں"

زمیان کو جیسے بہانہ ہاتھ آگیا۔ "کیا تم بھی ایسا نہ کرو گی۔ کیا تم نہ چاہو گی تارا؟"

تارا کے چہرے پر ایک خفیف سی غم انگیز زردی چھا گئی۔ وہ سوچنے لگی۔ پھر مسکرائی۔ "کیوں نہ چاہوں گی۔ شوہر کی پرستش تو فرض ہے۔ اور تم

تو بہت ہی مہربان ہو۔"

یہ گفتگو یہیں ختم ہو گئی۔ کیونکہ تارا کا باپ اور مسٹر فرامرز نزدیک ہی باتیں کرتے اس طرف آ رہے تھے۔

دونوں اُٹھ کر اس طرف بڑھے۔ مسٹر رستم جی نے مشفقانہ اور بزرگانہ انداز سے کہا۔ "دیکھئے آپ کے دوست آپ کو ڈھونڈ رہے ہیں۔"

فرامرز نے تارا سے ہاتھ ملانے کے بعد زمان سے مخاطب ہو کر کہا۔ "مَیں سمندر کی سیر سے واپس آ رہا تھا۔ خیال آیا۔ کہ آپ کو ساتھ لیتا چلوں۔ مکان کے متعلق بھی دریافت کرنا ضروری تھا۔"

زمان راز و نیاز میں مکان دریافت کرنا بھول گیا تھا۔ اب اسے یاد آیا۔ "مجھے یاد ہی نہ رہا۔ میرے خیال میں اگر کوئی مکان ہو تو مسٹر رستم جی کو آپ سے بہتر کرایہ دار نہیں مل سکتا۔"

رستم جی اپنے بھاری شانوں کو ہلا کر ہنسے۔ "مَیں سمجھا آپ کو وکالت کے لئے دفتر کی ضرورت ہے۔ ٹھہریئے۔"

پھر کچھ سوچ کر بولے۔ "تارا بیٹی کو فسا مکان خالی ہے؟"

تارا نہ جانے اس وقت کس خیال میں محو تھی۔ وہ اس سوال پر چونک

مُٹھی: ”ابّا خالی مکان۔“

رستم جی نے جلدی سے کہا۔ ”مجھے یاد آ گیا۔ لیجئے صاحب کل آپکو مکان مل جائے گا۔ یہاں سے بالکل نزدیک ہے۔ وہ سو گز کے فاصلے پر کل تارا آپ کو مکان دکھا دے گی۔“

(۳)

شادی کے دن قریب آتے گئے۔ انواع و اقسام کی ریشمی اور زر دوز ساڑھیاں، نئے ملبوس، جواہر، زیورات خریدے جانے لگے۔ دھوم دھام کی تیاریاں ہونے لگیں۔ دوستوں کی طرف سے تحفے آئے۔

مسٹر فرامرز کی وکالت کا کام کچھ ایسا نہیں چلا۔ اوّل تو نیا نیا کام دوسرے ان کو مسٹر رستم جی کی محبّت نے اپنی طرف مشغول کر لیا۔ اور صبح و شام تارا کے گھر میں جانا ان کا روزانہ معمول ہو گیا۔ زریان کا مکان زیادہ فاصلے پر تھا۔ اِس لئے مسٹر فرامرز تیسرے چوتھے وہاں جاتے تھے۔ وہ بھی گھڑی بھر کے لئے۔

زریان کو اپنی محبوبہ کے سوا اور کسی کا خیال ہی نہ تھا۔ وہ اپنی تقدیر پر نازاں تھا۔ جوں جوں شادی کا دن قریب آتا گیا۔ اسکے شوق و وارفتگی

میں ترقی ہوتی گئی۔ وہ خوشی کی بلندیوں پر پرواز کر رہا تھا۔

لیکن تارا کی حالت کچھ اور تھی۔ کھیل کود ہنسی بھولا پن کی تمام حالتیں خموشی، متانت اور سنجیدگی میں تبدیل ہو گئیں۔ اگلی بشاشت اور چمک دمک پر اداسی کا بادل چھا گیا۔

زمیان نے اکثر دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے لیکن اس نے زیادہ پروا نہیں کی۔ وہ خیال کرتا تھا کہ والدین سے جدائی پر لڑکیوں کو قدرے رنج ہوا ہی کرتا ہے۔

اتفاق سے ایک دن وہ صبح صبح کسی کام کے لئے فرامرز کے ہاں جاتے ہوئے تارا کے مکان کے قریب سے گزرا۔ سورج نکلے زیادہ دیر نہ ہوئی تھی اس نے دیکھا کہ قرمزی ساڑھی پہنے اس کی محبوبہ دوسری طرف سے اپنے مکان کی طرف جھپٹی چلی آ رہی ہے۔ اس کا چہرہ بشاش معلوم ہوتا تھا۔ اور اپنے خیال میں محو بغیر زمیان کو دیکھے اس کے پاس سے گزر رہی چلی تھی کہ اس نے اسے مخاطب کر لیا۔

"یہ صبح صبح کہاں کی سیر ہو رہی ہے۔ میرا تو خیال تھا۔ آپ خواب نوشیں سے بیدار بھی نہیں ہوئی ہوں گی۔"

تارا چونک اُٹھی۔ اس کے چہرے کا رنگ یکلخت زرد پڑ گیا۔ منہ پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

"نہیں میں تو ہمیشہ صبح اُٹھنے کی عادی ہوں۔ اور کچھ دنوں سے تو ۴ بجے ہی آنکھ کھل جاتی ہے۔"

زیبان کو اس کی اس کیفیت سے تعجب سا ہوا۔ اُس نے کہا۔

"خوب مجھے معلوم ہی نہیں ہوا۔ ورنہ میں بھی اس صبح کی پُر لطف سیر میں شامل ہوا کرتا۔"

"کیوں تم کچھ بیمار ہو۔ تم کانپ رہی ہو۔"

واقعی تارا بیمار معلوم ہوتی تھی۔ مگر اُس نے اپنے آپ کو سنبھالا، اور کہا "نہیں معمولی سی تکان ہے۔ پھر بات ٹالنے کے انداز سے پوچھا۔

"کہاں جا رہے ہو۔"

"ذرا فرامرز کی طرف جا رہا ہوں۔"

تارا ہنسی "دوستی بھی جی کا جنجال ہے۔ بہر حال ہو آیئے۔ واپس آکر چائے پیتے جایئے گا۔"

زیبان یہاں سے چلا تو دُور سے فرامرز صاحب کے برآمدے پر

نگاہ جا پڑی۔ فرامرز اس وقت برآمدے میں ٹہل رہے تھے۔ اور آہستہ آہستہ کچھ گنگنا رہے تھے۔ ہاتھ میں ایک کاغذ کا ٹکڑا یا کوئی تصویر تھی۔ جسے بار بار دیکھتے جاتے تھے۔ زریان پر نظر پڑتے ہی کاغذ کا ٹکڑا جیب میں ڈال لیا۔ اور مسکراتے ہوئے چبوترے سے اُتر کر مصافحہ کرنے کو بڑھے اور تپاک سے بولے "اہا صبح صبح کہاں کے ارادے ہیں"

"آپ نظر ہی نہیں آتے۔ وہ تو شکر ہے۔ کہ آپ پیاری تارا کے مکان کے قریب ہی رہتے ہیں۔ ورنہ ملاقات ہی نہ ہوتی"

یہ کہتے ہوئے زریان فرامرز کے ساتھ برآمدے کے چبوترے پر چڑھ گیا۔ برآمدے میں کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ دونوں بیٹھ گئے۔

فرامرز نے ہنستے ہوئے جواب دیا "غرض تو ملاقات ہی سے ہے۔ آپ کے مکان پر نہ سہی آپ کی محبوبہ کے مکان پر سہی۔ اور سچ پوچھو، تو مجھ ایسے نکمے اور عشق و محبت سے بے بہرہ آدمی سے آپ کو ملاقات کا لطف کیا خاک ملتا ہوگا"

زریان نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں۔ وہ اس وقت غور سے زمین پر پڑی ہوئی ایک جڑاؤ آلپین کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اسی طرح کی ایک جڑاؤ آلپین کچھ دن گزرے زمیان نے اپنی منسوبہ کی نذر کی تھی۔ جسے تارا ہمیشہ اپنے خوشنما سیاہ بالوں میں لگائے رہتی تھی۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر آلپین کو اُٹھا لیا۔ اور اپنے دوست سے پوچھنے لگا۔ "یہ آلپین تارا کی معلوم ہوتی ہے"

فرامرز نے جلدی سے آلپین اس کے ہاتھ سے لے لی۔ اور تعجب سے اُسے دیکھنے لگا۔

"شاید اسی کی ہو۔ کل دوپہر وہ یہاں اس کرسی پر بیٹھی تھی۔ جہاں تم بیٹھے ہو۔ بہرحال۔ مَیں نے اسے دیکھا نہیں۔ اچھا ہؤا آپ نے دیکھ لیا۔ ہیرا بہت خوبصورت ہے۔"

زمیان اس وقت سوچ رہا تھا۔ کہ شام کے وقت آلپین اس کے بالوں میں چمک رہی تھی۔ پھر اس نے خیال کیا۔ شاید کوئی دوسری ہو۔ اور گم ہو جانے کی زیادہ پروا نہ کر کے تارا نے اس کا ذکر نہ کیا ہو۔

وہ اسی خیال میں غلطاں تھا کہ فرامرز کے قہقہے نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا: "کہئے آپ کی شادی میں کتنے دن باقی ہیں۔ یار ہو خوش نصیب

تارا جیسی بیوی قسمت سے ملتی ہے۔"

زیمان نے مسرت سے اپنے دوست کا ہاتھ دباتے ہوئے جواب دیا۔" بھائی میں واقعی خوش نصیب ہوں۔ میری خوشی کی کوئی انتہا نہیں اب تو صرف دس دن باقی رہ گئے ہیں۔"

" دس دن! اوہو۔" فرامرز نے اس تعجب سے کہا۔ کہ زیمان اس کے لہجے سے بہت حیران ہوا۔

پھر ہنس کر بولا۔" یار معاف کرنا۔ ہم وکالت پیشہ لوگوں کو نسیان کا عارضہ لاحق ہو جاتا ہے۔ میرا خیال تھا کہ آپ کی شادی میں ابھی ایک مہینہ باقی ہے۔ لو میں نے اب تک کوئی تحفہ بھی تمہاری حسین دلہن کے لئے نہیں خریدا۔

زیمان کو اس وقت ایسا معلوم ہوا۔ کہ فرامرز دنیا داری کی باتیں کر رہا ہے مگر اس نے دل ہی دل میں اپنے خیال پر نفرین کی۔ اور چڑاؤ الپین اُٹھاتے ہوئے جو فرامرز نے کرسی کے بازو پر رکھ دی تھی۔ بولا۔" دن یاد رکھنا۔ تو اب میں جانا چاہتا ہوں۔ بابا کئی دن سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ کل وہ آنے والے ہیں۔ اور ان کے آنے سے پیشتر مجھے دفتر کا کام ختم

کر دینا چاہیئے۔ کیونکہ پھر مجھے کئی ہفتہ کے لئے کام سے بالکل علیحدہ رہنا پڑے گا۔"

یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اور اپنے دوست سے ہاتھ ملا کر تارا کے گھر کی طرف واپس لوٹا۔

سورج نکل آیا تھا۔ اور تارا اپنے کمرے میں تنہا تھی۔ وہ بہت تپاک سے ملی۔ اپنے ہاتھ سے چاء بنا کر پلائی۔ آلپین کے ذکر پر بہت ہنسی اور کہا "یہ کل سے گم تھی۔ شاید آپ کے دوست کے ہاں گر گئی ہو۔ میں اکثر جب یہاں سے اکتا جاتی ہوں۔ تو ان سے ملنے چلی جایا کرتی ہوں۔"

زریاب کی بالکل تسلی ہو گئی۔ اور وہ ہنسی خوشی وہاں سے رخصت ہو کر اپنے گھر آیا۔

(۴)

اسی دن شام سے کچھ پہلے بہت زور کی گھٹا اٹھی، اور موسلادھار مینہ برسنے لگا۔ زریاب کچھ تو کام کی کثرت کے سبب جو باپ کی غیر حاضری کے سبب اسے انجام دینا تھا۔ اور کچھ بارش کے سبب تارا کے ہاں نہ جا سکا۔ پانچ بجے جب دفتر بند ہو گیا۔ اور کلرک سب چلے گئے۔ تو وہ

چپراسی سے بھی کھاتے اُٹھوا کر اپنے کمرے میں لے گیا۔ اور حساب کی پڑتال میں مصروف ہو گیا۔ پھولوں اور بیلوں سے لدے ہوئے برآمدے سے باہر ہوا اور پانی باہم جنگ و جدل میں مصروف تھے۔ ہولناک رات تھی۔ رہ رہ کر بجلی چمکتی تھی۔ اور چمک کے ساتھ رعد کی دل ہلا دینے والی گرج سنائی دیتی تھی۔ زریاب کا دل نہ جانے کیوں خود بخود بیٹھا جاتا تھا۔ وہ کام کی کثرت سے بارہا اُکتا جاتا اور سگرٹ سلگا کر عناصر کے بھوتوں کی چیخ پکار سننے لگ جاتا۔ اسی عالم میں کلاک نے ۹ بجائے۔ اب اس کا دماغ تھک گیا تھا۔ ہندسے اور حروف رجسٹر کے صفحے پر ناچتے دکھائی دیتے۔ اس نے مجبور ہو کر قلم ہاتھ سے رکھ دیا۔ اور ستانے کے لئے کرسی سے سر ٹیک کر آنکھیں بند کر لیں۔ مگر وہ تعجب سے چونک کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے دروازے پر کوئی شخص آہستہ آہستہ دستک دے رہا تھا۔ سوچنے کے بغیر کہ ایسے وقت میں دستک دینے والا کون ہو سکتا ہے اس نے جلدی سے کواڑ کھولا۔ سرد ہوا کا ایک جھونکا آیا۔ اور اس کے ساتھ ایک صدا اس کے کان میں آئی۔ "زریاب" اور دو کانپتے ہوئے نازک ہاتھ اس کی طرف بڑھے۔

"ارے تارا" اور وہ دیوانہ وار۔ گویا اسے گود میں اُٹھا کر کمرے کے اندر لے آیا۔

تارا سردی سے کانپ رہی تھی۔ اس کے کپڑے پانی میں شور بور ہو رہے تھے۔

نریمان نے دونوں ہاتھوں سے اس کا بھیگا ہوا کوٹ اتارتے ہوئے محبت سے پوچھا۔

"جانِ من ایسے وقت میں اتنی دُور تکلیف کرنے کی جرأت کیوں کی۔ مَیں تو صبح خود ہی حاضر ہو جاتا۔ اور تم تو بالکل ٹھٹھر رہی ہو۔"

سادہ لوح عاشق سمجھا۔ کہ میں آج شام حسب معمول حاضر نہ ہو سکا تھا۔ اس لئے میری باوفا معشوقہ خود آگئی ہے۔ اس کا دل خوشی اور تفاخر کے جذبات سے لبریز تھا۔

"لیکن تمہارا چہرہ کتنا اُترا ہوا ہے۔ تم ضرور بیمار ہو۔ یہ کہہ کہ وہ اپنا گرم کوٹ اُسے اوڑھانے کے لئے کھونٹی سے اتارنے لگا۔

تارا نے کانپتی ہوئی آواز سے اسے روک دیا اور کہا۔ "آپ تکلیف نہ کیجئے مَیں اچھی ہوں۔ بہت اچھی ہوں۔ مَیں آپ سے چند ضروری باتیں

کہنے آئی ہوں۔"

یہ کہہ کر اُس نے لمبا اور ٹھنڈا سانس لیا۔ اس کا چہرہ بالکل زرد تھا۔ کیا وہ بیمار تھی!

نریمان کے دل میں ایک مبہم سا وسوسہ گزرا۔ "نہ جانے کیوں آئی ہے؟" اس کا دل اس کے حلق میں اٹک گیا۔ اور وہ چپ چاپ اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور اس کا منہ تکنے لگا۔

اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ "یہ کیا کہنے والی ہے۔" تارا وحشی ہرنی کی طرح اس کو تک رہی تھی۔ شاید لفظ اس کے خشک گلے میں پھنس رہے تھے۔

نریمان جی کڑا کر کے بولا۔ "کہو۔ کہو۔ وہ کونسی ایسی بات ہے جس کے لئے تم نے اس طوفان میں اتنی دُور سے آنے کی تکلیف گوارا کی۔ کہہ دو۔ کہہ دو۔ مجھ سے کیا پردہ ہے۔ کیا گھر میں کسی سے جھگڑا ہو گیا۔ کوئی تم پر خفا ہوا۔"

تارا کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

نریمان کا طائرِ دل سینے میں پھڑپھڑا یا۔ "تم رو رہی ہو۔ وہ کونسی

ایسی بات ہے۔ سب کچھ کہہ دو۔ صرف یہ نہ کہنا۔ کہ میں تمھیں پیار نہیں کرتی۔"

"آہ یہی تو میں کہنا چاہتی ہوں۔ تم کو معلوم ہو جانا چاہئے تھا۔ افسوس میں نے پہلے کیوں نہ کہہ دیا۔"

زرمان کو ایسا معلوم ہؤا کہ زمین اس کے پاؤں تلے سے نکل گئی۔ وہ بالکل ساکت اس کے مُنہ کی طرف دیکھنے لگا۔

پھر وہ بولی: "زرمان میں نے تمھیں کبھی نہیں چاہا۔ مجھے معلوم ہی نہ تھا۔ کہ چاہت کیا ہوتی ہے۔"

زرمان یکایک کرسی سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اُس کے پاؤں لڑکھڑائے اس نے اپنا ایک ہاتھ تارا کی کرسی پر ٹیک دیا۔ اور اس کے چہرے کو غور سے دیکھتا رہا۔

تارا کا چہرہ بالکل سفید تھا۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ اس کی صورت پر مُردنی چھائی ہوئی تھی۔

زرمان گلوگیر آواز سے بولا۔ "کیا یہ سب خواب تھا تارا۔ یہ نئی بات ہے۔ کیا یہ سب مذاق تھا۔ یا اب تم مذاق کر رہی ہو۔"

تارا نے ملتجی نگاہیں اس کے چہرے پر ڈالیں۔

"کچھ بھی سمجھو۔ مَیں صاف صاف کہہ دینا چاہتی ہوں۔ میرے دل میں تمہارے لئے کبھی وہ محبّت پیدا نہیں ہوئی، جو عورت کو مرد سے ہوتی ہے۔ اب مجھے اس کا حال معلوم ہوا۔ اب مجھے پتہ چلا۔ کہ مَیں نادانستہ طور پر تم کو دھوکا دے رہی ہوں۔ میری محبّت تم سے نہیں۔ بلکہ۔۔۔۔"

یکایک ایک شبہہ زیبان کے دل میں اُبھرا۔ اُس نے متجسّس نگاہیں ڈال کر تارا سے پوچھا "خوب۔ اب تم کسی اَور کو چاہتی ہو۔ وہ کون ہے؟"

تارا کے چہرے پر ہلکی سی سُرخی آگئی۔

"کیا تم مجھے معاف کر دو گے۔ کیا تم نسبت توڑنے پر رضامند ہو؟"

زیبان کو غصّہ آگیا۔ "تارا تم ظلم کر رہی ہو۔ تم کو اپنی چاہت کا حال بتانا پڑے گا۔ ہاں تم کو بتانا پڑے گا۔ کہ وہ کون ہے؟"

اُس نے اپنا پاؤں زور سے اِس طرح زمین پر مارا کہ تارا کانپ گئی۔

"تمہیں اس کا نام جاننے کی کیا ضرورت ہے۔ تم سمجھ لو کہ میں تمہارے قابل نہیں ہوں۔ تمہیں رنج ہوگا۔ نہیں نہیں میں نہیں بتا سکتی۔"

زریان ہنسا: "دیکھو تارا تم میری محبت کو نہیں سمجھیں۔ تم نہیں جانتیں۔ کہ میں تمہیں کس دل سے چاہتا ہوں۔"

پھر تھوڑی دیر ٹھہر کر اس نے پوچھا: "وہ کون ہے۔ جس نے تم کو میری آغوشِ محبت سے جدا کرنے کی جرأت کی ہے؟ تم کو بتانا پڑے گا؟"

"تم اس طرح نسبت کو نہیں توڑ سکتیں۔ یہ مقدس عہد ہے نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا؟"

"مجھے اس کا نام جاننا چاہیے؟"

یکایک اس کے دل میں ایک خیال آیا۔ اور اس خیال نے اس کے اندرونی جذبات کی گہرائیوں میں ہلچل ڈال دی۔

"کیا وہ فرامرز ہے؟"

یہ نام اس طرح اس کی زبان سے نکلا۔ کہ تارا لرز گئی۔ اس کی آنکھیں جھک گئیں۔ اس کے منہ سے بے ساختہ "آہ" نکل گئی۔

اب زریان سب کچھ سمجھ گیا۔ اسے ایسا معلوم ہوا کہ زمین گھوم رہی

ہے۔ کمرے کی ہر ایک چیز اپنی اپنی جگہ سے اُٹھ کر خلا میں گردش کر رہی ہے۔ اب اس پر تارا کی افسردگی غمگینی کا سب حال ظاہر ہو گیا۔ اسے آلپین کے واقعہ کے معنی معلوم ہو گئے۔

(۵)

وہ سیدھا کھڑا ہو گیا۔ پھر یکایک اُس نے میز کی دراز کھولی۔ اس میں سے پستول نکالا۔ تارا کی طرف بھیانک نگاہ سے دیکھا۔ اور دفعتاً دروازہ کھول کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ وہ غیظ و غضب میں اندھا ہو رہا تھا۔

" نریمان۔ نریمان۔ تم کیا کرنے چلے ہو۔ اپنے آپ کو سنبھالو۔ تارا بیکار پکارتی رہ گئی۔ اور نریمان بارش اور اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

تارا بھی اس اندھیری رات میں اس کے پیچھے پیچھے بھاگی۔ بارش کی بوچھاڑ مُنہ پر پڑ رہی تھی۔ ہوا اُڑائے لئے جاتی تھی۔ بجلی کی چمک میں دُور سے نریمان بھاگتا ہوا جاتا دکھائی دے رہا تھا۔ اور تارا گرتی پڑتی اس کے پیچھے پیچھے چلی جاتی تھی۔ فاصلہ جیسے تھوڑی ہی دیر میں طے ہو گیا۔

اپنے مکان کے دروازے پر اُس نے زیبان کو جا لیا۔ وہ دیوانہ ہو رہا تھا۔

"زیبان رحم کرو۔" اس کا سانس اُس کے پیٹ میں نہ سماتا تھا۔ "تم کیا کرنے لگے ہو۔ کیا تم دیوانے ہو گئے ہو۔ جاؤ۔ تم اپنے گھر جاؤ۔"

زیبان نے زور سے اپنا دامن چھڑا لیا۔ اور پھر جوش میں بھرا ہوا فرامرز کے مکان کی طرف بھاگا۔ تارا بھی پیچھے پیچھے بھاگتی ہوئی چلی گئی۔
بجلی چمکی اس کی روشنی میں اُس نے دیکھا کہ زیبان فرامرز کے برآمدے کے چبوترے پر چڑھ گیا۔ وہ چلائی۔ "خدا کے لئے میری بات سُن لو۔ یہ کہتے کہتے وہ بھی چبوترے پر چڑھ کر برآمدے میں داخل ہو گئی۔ زیبان نے جوش میں اپنے پاؤں کی ٹھوکر لگائی۔ دروازہ کھُل گیا۔

لیکن یہ کمرہ خالی تھا۔ اور دوسرے کمرے میں سے روشنی شیشوں سے چھن چھن کر آ رہی تھی۔ تارا زیبان کے بازو میں لپٹ گئی۔ اُس نے اپنے کمزور اور لرزاں ہاتھوں سے پستول چھیننے کی ناکام کوشش کی۔

"اس کو نہ مارو۔ قصور میرا ہے۔ میرا کام تمام کر دو۔"

زیبان نے پرواہ نہ کی اور زور سے دروازے پر دستک دی۔

اندر سے کسی نے انگریزی زبان میں کہا "کون ؟"

مگر یہ آواز فرامرز کی نہ تھی۔ بلکہ کسی عورت کی معلوم ہوتی تھی۔

زیبان پھر پکارا "دروازہ کھول دو۔"

چٹخنی کے اٹھنے کی آواز آئی۔ اور دروازہ کھل گیا۔

تارا اور زیبان یکایک دو قدم پیچھے ہٹ گئے۔ یہ ایک انگریز خاتون تھی۔ جو حیرت سے ان دونوں کا منہ تک رہی تھی۔

"آپ کون ہیں ؟ میرے شوہر مسٹر فرامرز آج شام سے کسی نامعلوم جگہ چلے گئے ہیں۔ وہ بتا کر بھی نہیں گئے۔"

زیبان اور تارا دونوں کے منہ سے بے ساختہ نکلا "آپ کے شوہر"

"ہاں انہوں نے ولایت میں مجھ سے شادی کر لی تھی۔ پھر وہ مجھے چھوڑ کر بغیر اطلاع دئے وہاں سے چلے آئے ہیں۔ میں آج شام ہی یہاں پہنچی ہوں۔"

عورت کی آنکھوں سے غمگینی اور حسرت ٹپک رہی تھی۔

تارا کے سینے سے ہلکی سی آہ نکلی۔ اور وہ بیہوش ہو کر گر گئی۔

زریان نے پستول جیب میں ڈال لیا۔ اور تارا کو سنبھالتے ہوئے اس نے انگریز خاتون سے کہا:۔

"معاف کیجیئے گا۔ ہمیں آپ کی شادی کے متعلق کچھ معلوم نہ تھا۔ میرا نام زریان ہے۔ کیا آپ مجھے مدد دیں گی۔ مَیں آپ کو حیرت انگیز افسانہ سناؤں گا۔

(۶)

دو دن کے بعد حالات بالکل متغیر نظر آئے فرامرز فیشن اور جذبات کا بندہ فرامرز اپنی انگریز بیوی کے اثر سے مرعوب ہو کر کہیں چلا گیا تھا۔ تارا کی آنکھوں کے آگے سے ایک پردہ سا ہٹ گیا تھا۔ فرامرز کی ظاہری درخشانی کا ملمع اُتر جانے سے زریان کی فطری نیکی اور خالص محبت زیادہ روشن نظر آنے لگی تھی۔

مقررہ تاریخ پر تارا اور زریان کی شادی ہو گئی :

وہ اپنے واہمے پر ہنسا

حیاتِ تازہ

ریاض نے اپنی زندگی میں مصائب اور ناکامیوں کے سوا کچھ نہ دیکھا تھا۔ شادی ہونے کے بعد اس کے ماں باپ ایک سال کے اندر اندر راہیٔ ملکِ عدم ہو گئے۔ اور ضروریاتِ حیات کا بار آغازِ شباب ہی میں اس کے سر پر رکھ دیا گیا ناتجربہ کاری سے زر و مال تجارتی ڈاکوؤں کے نذر ہو گیا۔ اور وہ خیال کرنے لگا۔ کہ دنیا نے مجھے لوٹ لیا ہے۔ رہی سہی پونجی اس کی بیوی تھی۔ جس کو وہ اپنے بدنصیب ہاتھوں سے آج دو ماہ ہوئے سپردِ خاک کر چکا تھا۔

بازارِ حیات میں قسمت آزمائی کی حوصلہ شکن ناکامیوں کے بعد یہ ایسا صدمہ تھا۔ جس نے اس کے حوصلے پست کر دئے۔ اور وہ صحرائے ہستی

میں اس خشک لکڑی کی طرح رہ گیا۔ جسے آگ لگا کر قافلے والے روانہ ہو جاتے ہیں۔

اب اسے کوئی ہمدرد نظر نہ آتا تھا۔ دنیادار اہلِ رشتہ اور منہ دیکھے کے یار آشنا تعزیت کے لیے آئے۔ اور اس کی بدبختی کا رونا رو گئے۔ تسلی کے عوض اس کو ان کی ماتم داری میں ایک قسم کا اندازِ استہزا نظر آیا۔

دو ماہ سے وہ اپنے فرسودہ مکان میں تنہا تھا۔ کئی مرتبہ جب اس کی بیوی کچھ دنوں کے لیے میکے چلی جاتی وہ تنہا رہا کرتا تھا۔ اس وقت اس کی راتیں امید افزا انتظار میں کروٹیں بدلتے کٹتی تھیں۔ ایک پُرلطف بے چینی اس کے دل کو بہلائے رہتی تھی۔ اس کی ولولہ انگیز بیتیوں میں گھر کی ہر ایک چیز ڈوب جاتی تھی۔ اُن دنوں اس کی بیداریاں لطیف اُمیدوں سے لبریز اور اس کی نیندیں خوش گوار خوابوں سے معمور رہا کرتی تھیں۔

لیکن آہ! موجودہ تنہائی بالکل برباد اور ویران تھی۔ اس سے پیشتر اسے اس قسم کی خاموش اور سنسان راتیں بسر کرنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ اب اس کی زندگی بالکل بے مقصد معلوم ہوتی تھی۔ وہ حیران نگاہوں سے در و دیوار کو تکتا۔ اور گم ہو جاتا۔ وہ اپنے آپ کو اس عظیم الشان تمدن میں

بالکل بے مصرف و ناکارہ چیز سمجھ رہا تھا۔ اس کی کیفیت زا بیسٹیاں دم بخود تھیں۔ اور اس کا انتظار ختم ہو چکا تھا۔

ابھی آدھی رات کا گجر نہیں بجا تھا۔ اور وہ اپنے گھر کے صحن میں چارپائی پر لیٹا ہوا آسمان کو تک رہا تھا۔ ہوا کی تھکی ہوئی رفتار گرد و پیش کی اداسی میں اضافہ کر رہی تھی۔ چودھویں کا چاند اس کے زرد چہرے پر طعن آمیز ہنسی ہنس رہا تھا۔ اور ستاروں کا درماندہ قافلہ اندوہ فزا خاموشی کے ساتھ چلا جا رہا تھا۔ ؎

زندگی در گردنم افتاد بیدل چارہ نیست
شاد باید زیستن ناشاد باید زیستن

اس کے لبوں سے ایک ہلکی آہ کے ساتھ یہ شعر نکلا۔ اور وہ ایک افسردہ انگڑائی لے کر اٹھ بیٹھا۔ اس کے تخیل نے دنیا والوں کے ظاہری اور خشک برتاؤ کی وجہ سے اسے اس جگہ کی ہر چیز سے بالکل متنفر کر دیا تھا۔ اس نے بے بس نگاہیں اپنے گھر کے در و دیوار پر ڈالیں اور اس کی آنکھوں سے آنسو کا ایک آخری قطرہ ڈھلک گیا۔

وہ بہت رو چکا تھا۔ اس نے دو ماہ گزرے اپنی بیوی کے

بالینِ مرگ سے اُٹھ کر تنہائی میں خدا کے حضور دُعائیں مانگی تھیں۔ آنسو بہائے تھے۔ گڑگڑایا تھا۔ مگر بے سود۔ موت نے اُس کی مسرّت کا خزانہ چھین لیا۔ اور اس کی آنکھوں کے سوتے خشک کر دئے۔

وہ اپنے سوچے ہوئے منصوبے کو تکمیل تک پہنچانے کے لئے آدھی رات کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کا مختصر سامانِ سفر ایک کمبل اور ایک بڑے تھیلے کی شکل میں چارپائی کے قریب دھرا تھا۔

"ترکِ تعلق۔ ترکِ تمدن۔ ترکِ دُنیا!"

تصوّر نے پہاڑوں اور جنگلوں کی غیر آباد جھونپڑیوں میں رہنے والے راہبوں کی ویران زندگی کے نقشے اس کی آنکھوں کے سامنے لا رکھے تھے۔ اور انسانوں کی سردمہری نے ایک تند اور جوشیلی نفرت کی فصیل اس کے گرد کھینچ دی تھی۔ اور وہ ظاہرداروں کی بستی چھوڑنے کے لئے بالکل تیار تھا۔

(۲)

اس کا سفر عظیم الشان اور اس کی ہمت کے لحاظ سے پُرشکوہ تھا۔ اب وہ دُنیائے خود غرض کے ہنگاموں سے بہت دُور کوہستانِ کشمیر سے

بھی پرے سرِبفلک پہاڑوں سے گھری ہوئی ایک چھوٹی سی وادی میں مقیم تھا۔ اس وادی تک پہنچنے کے لئے وہ کسی شاہراہ یا کسی پگڈنڈی کا مرہونِ منت نہ تھا۔ بلکہ وہ یہاں پہنچنے کو ایک معجزہ خیال کرتا تھا۔

اس نے کوہستان کا چپہ چپہ روند ڈالا۔ مگر اس وادی سے زیادہ آرام وہ پُرفضا اور انسانی آلائشوں سے پاک اور کوئی جگہ نہ دیکھی۔ اور اُسے اپنے رہنے کے لئے منتخب کر لیا۔ اس نے بڑی محنت کے ساتھ ایک بڑی چٹان کی آڑ میں پتھروں اور درختوں کے پتوں کو ملا کر ایک خوشنما اور پُرامن جھونپڑی بنا لی۔ اس کو عطر بیز اور گلپوش بیلوں سے سجایا۔ اور اس میں رہنے لگا۔

جب صبح کا دھندلکا منتشر ہو جاتا اور آفتاب برفانی چوٹیوں کو تاجِ زریں پہنا دیتا۔ وہ فریضۂ صبح ادا کرنے کے بعد ایک خودمختار بادشاہ کی طرح اپنی جھونپڑی سے نکل کھڑا ہوتا۔ اور وادی کے درمیان نہایت متانت سے بہنے والے شفاف چشمے کے کنارے کنارے آہستہ آہستہ ٹہلتا۔

خوشبودار پھولوں سے پٹا ہوا دامن کوہ اس کی آنکھوں میں اطمینان کا نور بھر دیتا۔ اور جواہرات کی طرح پھلوں سے لدے ہوئے درختوں میں

چڑیوں کے لطیف نغمے اس کے تلخ خیالات دل سے محو کر ڈالتے۔ اس کا سارا سارا دن مچھلیاں پکڑنے، اپنے خود ساختہ غلیل سے پرندوں کا شکار کرنے اور بھوننے، درختوں سے پکے ہوئے پھل توڑنے اور ان کو بارش اور برف باری کے دنوں کے لئے سُکھانے میں صرف ہو جاتا۔

اناج نہ یہاں مل سکتا تھا اور نہ فطرت کی طرف سے پھلوں، پرندوں اور خرگوشوں کی وسیع بخشش کے باعث اسے اس کی احتیاج تھی۔ ایندھن بے شمار اِدھر اُدھر پڑا تھا۔ وہ اسے جمع کرتا اور برفباری کے دنوں کے لئے اپنے جھونپڑے کے ساتھ کی پہاڑی کھوہ میں انبار لگا دیتا۔

کبھی کبھی جب وہ اپنی تنہائی سے اُکتا جاتا اور ہم جنس کی یاد اس کے دل کو پریشان کرتی۔ تو وہ اپنے خود غرض دستوں کی یاد سے اپنے گرد اس وادی کے پہاڑوں سے بھی زیادہ بلند ایک دیوار قائم کر لیتا تھا۔ اس وقت اس کے ہونٹوں پہ ایک حقارت آمیز تبسّم آجاتا تھا۔

وہ گرمی کے دنوں میں کئی کئی مرتبہ سرد اور آئینے کی طرح صاف

ندی میں اتر جاتا۔ پھر وہاں اس کی ہلکی اور رواں لہروں اور تہ میں چمکنے والے کنکروں سے کھیلتا۔ اور پھر داڑھی اور سر کے بڑھے ہوئے سیاہ بالوں کو نچوڑتا ہوا باہر نکل کر اپنا کھال کا لباس پہن لیتا۔ شکاری چھرا اپنی کمر میں لگاتا اور اپنی غلیل لے کر پہاڑوں اور چٹانوں پر پھلانگتا پھرتا۔

شام کے وقت جب مغرب کی جانب سے ایک نورانی شعاع تمام پہاڑوں اور ندی کے نالوں کو ارغوانی رنگ میں رنگ دیتی۔ اس وقت وہ فریضۂ مغرب کے لئے کھڑا ہو جاتا۔ اور اس سچے دل سے خداوندِ قدوس کی تعریف و تسبیح کرتا کہ اس کا دل خوشی سے معمور ہو جاتا تھا۔

پھر وہ دن بھر کی جھوٹی ہوئی حلال اور پاکیزہ چڑیوں اور خوش ذائقہ پھلوں کو شکریہ اور رغبت کے ساتھ کھانے بیٹھ جاتا۔ اور جب سیاہی اس وادی کو اپنے دامن میں چھپا لیتی تو وہ آہستہ آہستہ اپنی خوشنما جھونپڑی میں داخل ہوتا۔ جہاں شبنم اور ہوا کی خنکی اسے کوئی ضرر نہ پہنچاتی۔

اس طرح تین سال گذر گئے۔ اور اس نے انسان تو کیا حشرات الارض اور درندوں کا نشان بھی اس جنت نشان وادی میں نہ دیکھا۔

اُسے کسی حوّا کی غیر موجودگی آتنا مضطرب نہ کرتی تھی۔ کہ وہ اسے چھوڑنے کے لیئے بیتاب ہوجاتا۔

(۳)

اسے یقین ہوگیا تھا کہ انسان اپنی ہوا و ہوس چھوڑکر کبھی اس غیر آباد خطّے کی طرف قدم نہیں اُٹھا سکتے۔ علاوہ بریں سینکڑوں کوس کے کوہستانی سلسلے کی دُشوار گزار صعوبتیں جن کا اس کو خود تجربہ تھا۔ اسے مطمئن رکھتی تھیں۔ اگرچہ کبھی کسی ہمجنس کو دیکھنے کا شوق اور کبھی دانہ گندم کی کشش تھوڑی دیر کے لئے اسے وادی سے نکلنے پر اُکساتی۔ مگر وہ ان خواہشوں کو بہ زور دبا دیتا تھا۔ اور اپنی شہنشاہی چھوڑکر کہیں جانے کے خیال پر اپنے آپ کو ملامت کرنے لگتا تھا۔

ایک روز شام کو وہ اپنے جھولے میں پھل اور دن بھر کے بھُونے ہوئے شکار لے کر اپنے وسیع جھونپڑے کی طرف لوٹ رہا تھا۔ تو اس کے دل میں انسانی دنیا کے خیالات کے ہجوم نے ہنگامہ برپا کر دیا۔ اُس نے ان خیالات کو دبانے کے لئے دشوار گزار بلندیوں پر نگاہ ڈالی۔ وہ ٹھہر گیا۔ اُس نے دُور افق پر بادلوں کے درمیان دو شکلیں متحرک دیکھیں۔

حیرت اور شوق کے ملے جلے جذبات نے اس کے قدموں کو زمین میں گاڑ دیا اور وہ غور سے دیکھنے لگا۔ ارغوانی بادلوں میں مبہم سی دو صورتیں نظر آئیں۔ اور پھر رفتہ رفتہ بڑھتی ہوئی تاریکی میں ڈوب گئیں۔ وہ اپنے واہمے پر ہنسا۔ اور جھونپڑی کی طرف چل دیا۔ چڑیاں درختوں کو لوریاں دے رہی تھیں اور فضا میں ایک تحیّر تھا۔ اور تذبذب!

نماز کے بعد وہ اپنے خشک گھاس کے گدگدے اور آرام دہ بستر پر لیٹ گیا۔ اور موجودہ آزاد اور پاکیزہ زندگی پر خدا کا شکر کرتا ہوا سو گیا۔ کیونکہ وہ بہت جلد سو جانے کا عادی تھا۔

وہ ایک پُر لطف خواب دیکھ رہا تھا۔ کہ ایک غیر متوقع انسانی آواز نے اسے بیدار کر دیا۔ اور وہ ایک پُر شوق گھبراہٹ میں گھبراتا ہوا اپنے جنگلی بستر سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے جلد جلد لباس پہنا۔ اور احتیاطاً چھرا کمر سے لگا کر جھونپڑی سے باہر نکلا۔

نکھری ہوئی چاندنی نے وادی کا حسن دوبالا کر رکھا تھا۔ ندّی پگھلی ہوئی چاندی کی ایک سفید چادر معلوم ہوتی تھی۔ سبزے پر شبنم کے موتی اور درختوں کے پتّے چاند کی کرنوں میں درخشاں نظر آتے تھے۔ اس نے تشویش

اور اضطراب کی نظریں چاروں طرف دوڑائیں۔ جھونپڑی سے چند گز کے فاصلے پر ایک چوڑی چٹان کے اوپر ایک شخص لیٹا ہوا تھا۔ اور اس کے سر پر ایک جھکی ہوئی صورت صاف نظر آ رہی تھی۔ اور ساتھ ہی کراہنے کی ہلکی مگر دردناک آواز اس کے کانوں میں آئی۔

ایکا ایکی ہم جنس کے شوقِ ملاقات اور فطری نیکی نے نفرت کے تمام خیالات اس کے دل سے دُور کر دئے۔ اور ان کی جگہ ہمدردی نے لے لی!

وہ ضرور بھٹکے ہوئے مسافر ہیں۔ اور ان اونچے پہاڑوں کو عبور کرتے وقت انہیں ضرور چوٹیں آئی ہوں گی"

یہ سوچ کر وہ جلد جلد شبنم آلود گھاس کو روندتا ہوا ان کی طرف بڑھا لیکن اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جب اُس نے دیکھا کہ جھکی ہوئی نو عمر نازنین لڑکی نے اس کے قدموں کی آواز سن کر سر اُٹھایا۔ اور خوف سے چیخ اُٹھی۔

لیٹے ہوئے بوڑھے آدمی نے کراہتے ہوئے اُٹھنے کی کوشش کی۔ اور وہ بھاری پستول کا نشانہ باندھ ہی رہا تھا کہ ریاض زور سے بول اُٹھا۔

"میں دُشمن نہیں ہوں۔ مدّت سے تنہا اس وادی میں رہتا ہوں

وہ دیکھو میری جھونپڑی قریب ہے۔

وہ انگلی سے اپنی جھونپڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انکے قریب پہنچ گیا۔ ان الفاظ سے نازنین کی تسلی ہو گئی۔ اور اس نے جھپٹ کر بوڑھے میاں سے پستول لے لیا۔ اور اس کے پلیوں سے بندھے ہوئے سر کو اپنے درماندہ اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے تھامنے لگی۔ اس نے رحم طلب نگاہوں سے ریاض کی طرف دیکھا۔ وہ اس کا مطلب سمجھ گیا۔ اور بوڑھے آدمی کو جو زخموں اور چوٹوں سے چکنا چور ہو گیا تھا۔ اور جس کا لباس قریب قریب ہر جگہ سے پھٹ گیا تھا۔ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ اس نے دیکھا تو بوڑھے کا چہرہ لہولہان ہو رہا تھا۔ اس کا ہونٹ کسی نوکدار پتھر پر گرنے کے سبب سے آدھے سے زیادہ پھٹ گیا تھا۔ اور اس پر خون جم رہا تھا۔ اور وہ اب تک تشویش ناک نگاہوں سے ریاض کی طرف دیکھ رہا تھا۔ گو اس کا خوف فی الجملہ کم ہو چکا تھا۔

اور جب ریاض نے شفقت سے اس کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا۔ تو بوڑھے کو بالکل تسکین ہو گئی۔ اس کے خون آلود ہونٹوں پر ہنسی کھیلنے لگی۔ اور اس نے ضعیف آواز سے بولنے کی کوشش کی :۔

"میں چُور چُور ہو رہا ہوں ——— پانچ دن رات کا خطرناک سفر جو ہیں۔ ناداں بچی ———"

یہ کہہ کر وہ تھک گیا۔ اور ریاض نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اور شفقت بھری سوالیہ نگہ نازنین پر ڈالی۔ جو اس عرصے میں چٹان کے ایک کونے پر اپنے پھٹے ہوئے کپڑوں کو چھپانے اور اپنے نازک جسم کی چوٹوں کے درد کو ضبط کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ چاندکی روشنی میں اس کا سفید چہرہ نور کی قندیل تھا۔

"تم بھی بہت تھکی ہوئی اور زخمی معلوم ہوتی ہو۔ ذرا اور ہمت کرو۔ تو بڑے میاں کو جھونپڑی میں لے چلیں۔ وہاں تمہیں آرام ملے گا۔"

نازنین نے جھینپتی ہوئی نظروں سے رضامندی کا اظہار کیا۔ اور لڑکھڑاتی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ دونوں مل کر بوڑھے آدمی اور دو ہلکی ہلکی گٹھڑیوں کو جھونپڑی تک لے جانے کے لیئے مستعد ہو گئے۔ ریاض نے بوڑھے کو سہارا دیا۔ جو ہلکے ہلکے کراہتا ہوا اپنے پاؤں پر اس کے ساتھ چل نکلا۔ خوشبو دار ہوا کے جھونکے وادی میں آزادی کے ساتھ سرسرا رہے تھے۔ اگرچہ لڑکی کے پاؤں بھی بہت زخمی تھے۔ لیکن وہ

اپنی ٹوٹی ہوئی چپل کو گھسیٹتی ہوئی دونوں گٹھڑیوں سمیت ریاض کے پیچھے پیچھے جھونپڑی میں داخل ہو گئی۔

ریاض نے گھاس کے بستر پر بوڑھے کو لٹا دیا۔ اور خود جھونپڑی کے دوسرے حصّے میں پتھر رگڑ کر آگ روشن کی۔ اور دن کا بھُنا ہوا گوشت اور پھل دونوں کے آگے رکھ دیئے۔ لیکن معلوم ہوا کہ ہونٹ کی سوجن کے سبب بوڑھا کچھ نہیں کھا سکتا تھا! ریاض نے جلد جلد اُسی گوشت کی یخنی بنائی۔ اور گرم گرم بوڑھے کو پلائی۔ اور بوڑھے کے زخم دھونے کے لئے لڑکی کو گرم پانی دیا۔ خود جھونپڑی سے باہر ایک چٹان کے سائے میں خشک گھاس پر اپنا پھٹا ہوا کمبل بچھا کر انسان کے مصائب پر غور کرتا ہوا سو گیا۔

(۴)

آفتاب نے مشرق کی پہاڑیوں سے سر نکالا۔ اور وادی پھر ایک دفعہ اس کے نور سے معمور ہو گئی۔ ریاض ذرا دیر سے اُٹھا۔ نماز پڑھی۔ اور اپنے زخمی مہمانوں کی خیر و عافیت دریافت کرنے کے لئے جھونپڑی میں داخل ہوا۔

لڑکی نے بوڑھے آدمی کو گٹھڑیوں کے سہارے بٹھا دیا تھا اور خود اس کے زخموں کو دیکھ رہی تھی۔ بوڑھا اس وقت رات کی نسبت بہت زیادہ اچھی حالت میں ہو گیا تھا۔ اس نے ریاض کے سلام کا جواب نہایت شستہ زبانی اور تپاک سے دیا۔ نازنین نے شرمگیں اور شکر گزار نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اور آنکھیں جھکا لیں۔

ریاض نے سوال کیا "بڑے میاں اگر تکلیف نہ ہو تو اپنے اس ناگوار سفر کا حال مجھے بتائیے۔ میرا خیال ہے کہ آپ راستہ بھول کر اس طرف آ نکلے ہیں۔"

بوڑھا فسردہ تبسّم کے ساتھ بولا۔ "بیٹا تُو نے میرے اور میری بچّی کے ساتھ جو مہربانی کا سلوک کیا ہے اس سے مجھے معلوم ہو گیا کہ تو کسی شریف شخص کا فرزند ہے۔"

پھر اُس نے اپنی سفید اور لمبی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا:۔

"مَیں اپنے محسن سے اپنا حال چھپانا نہیں چاہتا۔"

ریاض اس فقرے سے بہت متعجب ہوا۔ اور اُس کے ضعیف چہرے کی طرف تشویش ناک نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

بوڑھا بولا "بیٹا دراصل مَیں پنجاب کا رہنے والا ہوں۔ اور ان بلند اور ویران پہاڑوں سے مجھے کچھ مناسبت نہیں۔ بدقسمتی اور صحبت بد کی وجہ سے اوائل عمر ہی میں مجھ کو چوری کی عادت پڑ گئی۔ اور بالآخر مَیں ڈاکو بن گیا۔"

پھر اس نے ریاض کو پریشان دیکھ کر کہا "نہیں نہیں ڈرو نہیں۔ مَیں جوانی کا ذکر کر رہا ہوں۔ مَیں نے کئی ڈاکے مارے۔ میری گرفتاری کے لئے انعام مقرر ہو گئے۔ اور مَیں وہاں سے بھاگ کر ان پہاڑوں میں آگیا۔ اور ایک دُور اُفتادہ گاؤں میں زمین خرید کر مکان بنا لیا۔ پھر مَیں نے ایک پہاڑی زمیندار کی لڑکی سے شادی کر لی۔ اور ڈاکے اور رہزنی کے پیشے سے تائب ہو گیا۔ آج پندرہ سال ہوئے میرے گھر یہ ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام مَیں نے زینب رکھا۔ مگر افسوس!"

اب اس کی آواز بھرّا گئی۔ ریاض نے دردمندی کی نگاہوں سے لڑکی کی طرف دیکھا۔ تو اس کی آنکھوں میں دو آنسو تھے۔

بوڑھے نے دم لے کر پھر اپنی داستان کو جاری رکھا۔

"ہاں تو اس کی پیدائش کے وقت اس کی ماں کا انتقال ہو گیا۔ میں نے

خود اسے پالنا شروع کیا۔ یہ جوان ہو گئی۔ مَیں نے اسے سارا حال بتا دیا تھا۔ اس نے میرے لئے دعائیں کرنے اور مجھے تسلّی دینے کے لئے اپنا خواب وخور حرام کر دیا۔ آج سات دن ہوئے مجھے معلوم ہوا کہ پنجاب کی پولیس نے میرا کھوج لگا لیا ہے۔ اور مَیں عنقریب گرفتار ہو کر پھانسی پہ چڑھا دیا جاؤں گا۔ مَیں گھبرا گیا۔ مجھے اپنی جان کی کوئی پروا نہ تھی مگر اس پیاری بیٹی کے خیال سے میری پریشانی بہت بڑھ گئی۔ مَیں نے قیمتی اور ضرورت کی اشیاء ان چھوٹی چھوٹی گٹھڑیوں میں باندھ لیں۔ اور ہم دونوں بھاگ نکلے۔ زینب نے مجھے جان بچانے اور بھاگ نکلنے کی ترغیب دی تھی۔ اور میرے ساتھ ان دور دراز پہاڑوں میں ٹھوکریں کھاتی ہوئی۔ قدم قدم پہ مجھے موت سے بچاتی ہوئی کل شام تمہاری وادی کے سربفلک برفانی پہاڑوں کی چوٹیوں سے گزار لائی۔ اس سفر میں ہم نے دن اور رات کچھ نہیں دیکھا۔ مَیں کئی جگہ گر گر کر بچا اور اس سعادت مند بیٹی نے مجھ راندۂ درگاہ کو ہر طرح آفات سے بچا کر یہاں تک پہنچایا۔ مَیں زخمی ہو گیا تھا۔ اگرچہ یہ بھی زخمی اور تھکی ہوئی تھی۔ لیکن اس باہمّت نے میری ہر طرح خبر گیری کی۔ پھر تم آ گئے۔ بیٹا یہ

ہے میری رام کہانی۔ کیا تم گھبرا گئے ہو؟"

"ہاں بڑے میاں میں آپ کے مصائب سے گھبرا گیا ہوں۔ مگر اب آپ کچھ فکر نہ کریں۔ مجھے اپنا خادم سمجھیں۔ اِس وادی میں کوئی نہ آنے پائے گا۔ میں کئی سال سے یہاں رہتا ہوں۔"

پھر وہ ان دونوں کو اٹھا کر ندی کے کنارے لے گیا۔ اور خود ان کے ناشتے کا سامان کرنے کے لئے درختوں کے پھل توڑنے میں مصروف ہو گیا۔ آفتاب بلند ہو چکا تھا۔ اور وادی کی ہر ایک چیز رات کی کلفت دُور کر کے تر و تازہ ہو گئی تھی۔ لڑکی نے اپنی گٹھڑی میں سے نیا لباس نکالا۔ اور ایک چٹان کی آڑ میں بیٹھ کر نہانے لگی۔ پھر اس نے پھٹے ہوئے لباس کی جگہ سادہ پہاڑی لڑکیوں کا لباس پہن لیا۔ اور اپنے باپ کے زخموں کو دھونے اور ان پر پٹیاں باندھنے میں مصروف ہوئی۔ اور جب ریاض پھل لیکر واپس آیا۔ تو اس کی نظر اس نازنین لڑکی پر پڑی۔ اس کے دل میں ایک خیال پیدا ہوا اور وہ دل ہی دل میں شرم سے کانپ اُٹھا۔

(۵)

ریاض نے سرگرمی سے اپنے تھکے ہوئے مہمانوں کی دلجوئی اور میزبانی

کا حق ادا کیا۔

اس نے پہلی مرتبہ اپنی تباہی کی داستان اپنے مہمانوں کے سامنے بیان کی۔ جسے سن کر بوڑھا بہت دیر تک اس کی برباد نوجوانی پر افسوس کرتا رہا۔

چند دن کی تیمارداری نے بوڑھے کی صحت کو بحال کر دیا۔ اس عرصے میں حسین زینب نے جس کے پاؤں کے زخم بھر چکے تھے۔ کھانا پکانے اور جھونپڑی کو صاف ستھرا رکھنے کا کام اپنے ذمے لے لیا تھا۔

وادی میں شاید پہلی مرتبہ ایک پُراسرار سی رونق اور چہل پہل پیدا ہو گئی تھی۔

جب بوڑھا بالکل تندرست ہو گیا تو اس نے وہاں سے بھی آگے جانے کا ارادہ کیا۔ ایک دن باپ بیٹی نے اپنی گٹھڑیاں باندھیں۔ اور ریاض سے رخصت ہونے کے لئے جھونپڑی سے باہر نکلے۔ لیکن ان کے دل بھی اس وادی کے دامنِ پناہ سے محروم ہونے پر افسردہ تھے۔

ریاض اس وقت صبح صبح نماز سے فارغ ہو کر ندی کے کنارے خیالات میں محو تھا۔ اس کی طبیعت اتنی ہی مدت میں تبدیل ہونے لگی

تھی۔ اور قسمت نے اتفاقاً پھر ایک بار اس کے مایوس دل میں غیر معلوم اور مبہم امیدوں کی لرزشیں پیدا کر دی تھیں۔

اس نے مدت کے بعد انسانوں کی صورتیں دیکھیں اور ان کی صدائیں سنی تھیں۔

بوڑھے کو جانے پر آمادہ دیکھ کر وہ پھر تنہا رہ جانے کے اندوہناک تصوّر سے مغموم ہو گیا۔ اور اس کی حسرتناک نگاہیں بوڑھے آدمی اور حسین لڑکی کے چہرے پر جم کر رہ گئیں۔ اور صرف یہ الفاظ بھرّائی ہوئی آواز میں اس کی زبان سے نکلے۔

"اچھا آپ نے کہیں جانے کا ارادہ کر لیا ۔ ۔ ۔ ۔ میں تو سمجھا تھا کہ میری تنہائی ختم ہو گئی۔

بوڑھے نے تعجّب سے اس کی طرف دیکھا۔ اور زینب کی نگاہیں وفورِ ہمدردی سے اشک آلود تھیں۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔ بوڑھا سر جھکا کر کچھ سوچنے لگا۔ اس نے اپنی بیٹی کی طرف دیکھا۔ جو کسی غمناک خیال میں محو ہو گئی تھی۔

اس نے وادی اور اس کے محافظ پہاڑوں پر متفکّر نگاہیں ڈالیں پھر

وہ ریاض کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

بوڑھے کے دل کو خدا جانے کن جذبات نے متاثر کر دیا۔ وہ اپنے ارادے سے لڑکھڑا گیا۔ آخر اُس نے ریاض سے پوچھا۔ "بیٹا کیا تمہیں میرے یہاں رہنے میں تکلیف تو نہ ہوگی۔ کیا تمہاری اپنی اختیار کی ہوئی تنہائی میں خلل تو نہ آئے گا۔"

ریاض کے چہرے پر مسرّت کی تمتماہٹ دوڑ گئی۔

"نہیں بابا اب مجھے کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ مَیں آپ کو اپنا باپ سمجھوں گا۔" لُٹ لینے والوں کی ملاقات سے انکاری اب مطمئن تھا۔

بوڑھے نے گٹھڑی زمین پر رکھ دی اور کہا "بیشک یہ وادی آسودگی اور حفاظت کا مقام ہے۔ اور مَیں تم پر بھروسہ کرتا ہوں۔"

پھر زینب کی طرف مخاطب ہو کر بولا "بیٹی آؤ ہم اس شریف آدمی کو اپنی قسمت کا شریک بنالیں۔ کیونکہ میرے لئے اب انسانوں کی کسی بستی میں جاکر رہنا خطرناک ہے۔ جاؤ سامان کھول ڈالو۔ اور اسی وادی کو اپنا گھر سمجھو۔" لوٹنے کی یاداشت سے فراری بھی مطمئن تھا—!

دھوپ پھیلنے لگی۔ ندی کی گرم جوش لہریں کناروں سے گلے ملیں

سوسن اور بنفشے کی کلیاں مسکرائیں۔ وادی کی ہر چیز متبسّم نظر آتی تھی۔ کیونکہ جوان اور بوڑھا نئی زندگی کا جھونپڑا بنانے کی تجویز کر رہے تھے۔

(۶)

پرانی جھونپڑی کے پہلو میں ایک اور وسیع کاشانہ بنایا گیا جس میں ایک عورت کے سلیقہ شعار ہاتھوں نے بہت سی آرائشی دلچسپیاں پیدا کر دیں۔ اب اس وادی کی فضا میں ایک کے بجائے تین انسانوں کی آوازیں گونجنے لگیں۔

ایک سال اور گزر گیا۔

ریاض اپنی گزری ہوئی مصیبتوں اور تلخ کامیوں کی یاد کو یکسر فراموش کر چکا تھا۔ اور اپنی طبیعت میں ایک خوشگوار روح نواز تبدیلی محسوس کر رہا تھا۔ وہ نفرت جو اسے انسانوں سے پیدا ہو چکی تھی۔ تقریباً دور ہو گئی۔ اب وہ شہروں کے ہنگاموں کی کہانیاں شوق سے سنتا۔ اور بوڑھے کے پاس بیٹھ کر متمدّن دُنیا اور اس میں بسنے والوں پر رائے زنی کیا کرتا۔ اسے جوانی کی ولولہ انگیز داستانوں میں پھر لطف آنے لگا۔ اس کی مردہ اُمنگوں میں ازسرِ نو تازگیٔ حیات پیدا ہوئی۔ اور اس کی نیندیں دلآویز اور لطیف

خوابوں سے پھر آباد ہو گئیں۔

شفاف چشمے کی سرد اور نرم خیز لہریں اسے شباب کے مستانہ جوش نغمے سنانے لگیں۔ پھولوں کے رنگ پہلے سے زیادہ شوخ ہو گئے۔ اور اور ان کی نگہت میں پہلے سے زیادہ لطافت اور مستی محسوس ہونے لگی۔

اس کو کئی قسم کی نئی نئی چڑیاں نظر آئیں۔ جو اس وادی میں کیسی اور جگہ سے ہجرت کر کے آگئی تھیں۔ اور اس کے غلیل کے شکاروں کی تعداد تین گنا ہو گئی تھی۔

یہ سب اس اسرار انگیز محبتِ پنہاں کا نتیجہ تھا۔ جو اسے اس ڈاکو کی دوشیزہ لڑکی سے پیدا ہو گئی تھی۔

اگرچہ اس لڑکی کا آسمانی حسن فرشتوں سے خراجِ تحسین وصول کرتا تھا۔ لیکن اس کے اطوار بالکل سادہ اور فطرت کے حقیقی رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے۔

جب ریاض اور بوڑھا اپنے اپنے غلیل لے کر شکار کو نکل جاتے تو زینب کبھی اس جنتِ ارضی کی پھولوں سے لدی ہوئی جھاڑیوں میں گھومنے چلی جاتی۔ اور کبھی صاف شفاف چشمے میں نہانے کے بعد اپنے

کاشانوں کو سجانے اور ان کو زیادہ آرام دِہ بنانے میں مشغول ہو جاتی۔ وہ بے محابا اس وادی میں جس سمت چاہتی چلی جاتی۔ اور رنگ بہ رنگ کے پھولوں سے ہار بدھیاں اور چمپا کلیاں بنا کر خود ہی پہنتی۔ اور خود ہی شرما کر ان کو توڑ ڈالتی۔ اکثر ایسا ہوتا کہ ریاض اسے اس حال میں دیکھ لیتا۔ اس وقت وہ شرما جاتی۔ اور نظر بچا کر چھپ جانے کی کوشش کرنے لگتی۔ ریاض وہاں سے ٹل جاتا۔

اس نے کبھی تنہائی میں اس سے کوئی غیر معمولی گفتگو نہ کی۔

لیکن بوڑھا ان دونوں کی دلی کیفیتوں کا حال جانتا تھا۔ ایک دن تیسرے پہر بلندیوں سے اترتے وقت وہ ایک چٹان پر بیٹھ گیا۔ اور ریاض کی طرف دیکھنے لگا۔

ان کی پشت پر ایک درخت کی جھکی ہوئی شاخوں میں دو بلبلیں نغمہ سرائی کر رہی تھیں۔ بوڑھے نے شفقت بھرے انداز سے کہا:۔

"بیٹا ریاض میں تجھے اپنا بیٹا سمجھتا ہوں۔"

ریاض اس غیر معمولی شفقت سے شرما گیا۔ اس نے جواب دیا" میں آپ کا بیٹا ہوں۔"

اس کا دل دھڑک رہا تھا۔

بوڑھے نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔

"نہیں شرماؤ نہیں۔ میں تم سے بہت خوش ہوں۔ میرا ارادہ ہے۔ کل شام سے پہلے پہلے زمین و آسمان اور خدا کو گواہ قرار دیکر زینب کا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں دے دیا جائے۔

ریاض زبان سے کچھ نہ بول سکا۔ اس کا سر جھک گیا۔ اور شکریے کے طور پر اس نے بوڑھے کا ہاتھ آہستہ سے دبایا۔

پھر وہ دونوں اپنا اپنا شکار اٹھا کر جھونپڑوں کی طرف چل دیئے۔

وادی پر چاروں طرف مسرّت کی شادابی برس رہی تھی۔ ہوا سے عطر سہاگ کی لپٹیں آ رہی تھیں۔ لڑکی گنجان جھاڑیوں کی معطر ٹھنڈک میں پھولوں سے کھیل رہی تھی۔ اور سرخ پھول اس کے نرم رخساروں پر قربان ہو رہے تھے۔ اور جب وہ شرم سے سر جھکائے ان کا خیر مقدم کرنے کو کنج سے باہر نکل آئی تو اس چھوٹی سی جنّت کی تنہا حور معلوم ہوتی تھی۔

(۷)

ریاض کی شادی کے ایک سال بعد بڑے میاں کا انتقال ہو گیا۔

جس سے دونوں میاں بیوی افسردہ رہنے لگے۔

لیکن جلد ہی خدا نے انہیں ایک خوبصورت بیٹا عطا فرمایا جس کا نام اقبال رکھا گیا۔ اقبال کی ولادت نے بوڑھے کی جدائی کا تعلق ایک حد تک دور کر دیا۔

ریاض کو موجودہ زندگی ایک مسلسل اور دلآویز خواب معلوم ہوتی تھی۔ وایہ بنا ایک نئی بات تھی۔

لیکن سچ مچ وہ دنیا سے دور پھر ایک بیوی کا شوہر اور ایک بچے کا باپ تھا۔ وادی اس کی سلطنت تھی۔ جس کا وہ مختارِ کل تھا۔

اس کے پاس ہزاروں روپے اشرفیاں اور نوٹ تھے۔ یہ تمام اسے زینب کے جہیز میں ملی تھیں لیکن وہ اسے بے مصرف خیال کرتا تھا۔

اس کی بیوی حسین۔ نیک اور محبت کرنے والی تھی۔ ان کی ازدواجی زندگی عام مناقشاتِ خانگی سے قطعاً پاک تھی۔ اس کے لیل و نہار وفورِ مسرت کے سبب گزرتے ہوئے معلوم نہ ہوتے تھے۔

آفتاب مشرق کے پہاڑوں سے ابھرتا اور وادی میں مسرت اور شادمانی بکھیرتا ہوا چلا جاتا تھا۔

چاند نکلتا اور ان کی جھونپڑی کے ارد گرد راحت ہی راحت پھیلا دیتا۔

وادی کی آبادی میں اور اضافہ ہو گیا یعنی اقبال کی ولادت کے تین سال بعد شوکت پیدا ہوا۔ گویا اب وہ دو سے چار ہو گئے۔ بوڑھے کی موت کو آٹھ سال گزر گئے۔ اقبال آٹھ برس کا اور شوکت پانچ برس کا ہو گیا۔

اور ان دونوں کو وادی کی چٹانوں پر کودتے پھاندتے درختوں پر چڑھتے اُترتے چشمے میں نہاتے دیکھ کر زینب کے دل میں ان کی تعلیم اور ان کی آئندہ زندگی کے تفکرات نے اپنا نشیمن بنا لیا۔

اب وہ گاؤں اور ننھیال کی یاد میں اُداس رہنے لگی۔ اور اُسے جب کبھی ریاض سے بات چیت کا موقعہ ملتا وہ دُنیا اور اپنے اعزّا و اقارب کے طول طویل قصے لے بیٹھتی۔ جنہیں سُن کر ریاض ششدر رہ جاتا۔ اور کچھ نہ سمجھتا۔ اگرچہ دشوار گزار سلسلۂ کوہسار حوصلوں کو پست کر دیتا تھا۔ مگر آخرکار دونوں نے اولاد کی آئندہ زندگی کے خیال سے اس سدا بہار جنّت کو چھوڑ کر متمدّن دُنیا میں چلے جانے کا فیصلہ کر لیا۔

ایک صبح جب وادی پر چھائے ہوئے آسمان کے ستاروں کی چمک مدّھم ہو رہی تھی۔ اور مشرق سے آنے والا قافلہ سفیدۂ سحر کا غبار

اُتر رہا تھا۔ ریاض اور اُس کی بیوی چھوٹی چھوٹی گٹھڑیاں پشت پر سنبھالے دونوں بچوں کے ساتھ ایک پھولوں سے ڈھکی ہوئی قبر پر فاتحہ پڑھ رہے تھے۔

وہ فاتحہ پڑھ کر تیزی سے چل نکلے۔ اور بلند چڑھائیوں پر چڑھنے لگے۔ کچھ فاصلہ طے کر کے وہ چاروں سستانے کے لئے ایک چٹان پر بیٹھ گئے۔ ریاض خاموش تھا۔ اس نے آخری نگاہ وادی پر ڈالی۔ اس کی جھونپڑی کے کھلے ہوئے دروازے کے قریب چشمے کا سفید پانی ایک بہتا ہوا آنسو معلوم ہو رہا تھا۔ اس کے قریب کی جھاڑیوں میں بلبل وداعی ترانہ گا رہی تھی۔

ریاض نے پُرنم آنکھوں سے زینب کی طرف دیکھا تو اس کے بھی آنسو رواں تھے۔

سمندر نے کہا۔ آبرو اُتر گئی تو ناک کٹ جائے گی

افسانہ در افسانہ

میری بیوی نے دوا پلائی۔ اور اس خیال سے کہ مکھیاں اور روشنی مجھے تکلیف دے رہی ہوں گی۔ دروازہ بند کر کے ساتھ کے کمرے میں جا بیٹھی۔ ننھی بچیاں بھی شاید میرے مزاج کی غیر معمولی اور نئی چڑچڑاہٹ سے روٹھ کر کھیلنے لڑنے جھگڑنے اور رونے کے لئے نیچے صحن میں چلی گئی تھیں۔

شدت کا بخار تھا۔ بنڈا اچک رہا تھا۔ میں اس تنہا کوٹھڑی میں کمبل اوڑھے خاموش لیٹا ہوا اپنے سانس کی آوازوں میں کھو گیا تھا۔ یہ اٹھتی اور بیٹھتی ہوئی آوازیں فرش سے چھت تک مسلسل گونج پیدا کر رہی تھیں۔

شاید میں اپنے سانسوں کے گننے میں محو تھا۔ کہ یہ سلسلہ بوڑھی دایہ کی کرخت آواز سے ٹوٹ گیا۔ وہ ساتھ کے کمرے میں میری بیوی سے میری

صحت کے متعلق پوچھ رہی تھی۔

یہ باتونی بڑھیا میری تیسری بچّی کی پیدائش کے وقت سے ہمارے گھر میں آنے جانے لگی تھی۔ مجھے اس سے نفرت تھی۔ اس نے اب کے بھی لڑکی ہی پیدا ہونے پر اظہارِ افسوس سے میری بیوی کو اور زیادہ غمناک بنا دیا تھا۔ محض بہت زیادہ انعام نہ ملنے کے اندیشے سے اس نے مجھے زچّہ خانے کے اندر داخل ہوتے دیکھ کر منہ لسورتے ہوئے کہا تھا۔

"کمبخت لڑکیاں! ہائے ہائے۔ اللہ کی مرضی۔ بیٹا رنج نہ کرنا۔ اللہ میاں لڑکا بھی دے گا۔"

بیوقوف بڑھیا! کیا وہ مجھے بھی اُن شوہروں جیسا سمجھتی تھی جو اپنی بیوی سے محض اِس لئے نفرت کرتے ہیں۔ کہ انہوں نے بیٹی کی بجائے بیٹا کیوں نہیں جنا۔

میں نے اُسی وقت اُسے جھڑک دیا تھا۔ میں نے تاکید کر دی تھی۔ کہ وہ آئندہ میری بیوی کے روبرو اس قسم کی باتیں نہ کیا کرے۔ مَیں نے کہہ دیا تھا۔ کہ ہمارے گھر میں بیٹے بیٹیاں برابر ہیں۔ بلکہ بیٹیاں برکت اور خدا کی رحمت سمجھی جاتی ہیں۔ میرے اس کہنے پر میری بیوی کی آنکھوں سے

اطمینان کے دو آنسو پھوٹ نکلے تھے ——

یہی لالچی بڑھیا اس وقت دوسرے کمرے میں میری بیماری کا حال پوچھ رہی تھی۔ میں اُس کی کرخت آواز سے چیخنے والا ہی تھا۔ کہ میری بیوی نے اُسے آہستہ بولنے کے لئے کہہ دیا۔ اور یہ سُن کر کہ میں ساتھ کے کمرے میں لیٹا ہوا ہوں۔ بڑھیا نے حتیٰ المقدور اپنے لہجے کو پست اور ملائم کر لیا اور میرے بخار کی شدّت کا حال سُن کر "موئی تپ" کو کوستی ہوئی بیٹھ گئی۔ پھر اُس نے کئی ٹونے ٹوٹکے بتائے۔ ایک پیر جی کا ذکر کیا۔ جن کے تعویذ سے بخار تیسرے دن اُتر جاتا تھا۔

اور اس دل سوزی کے اظہار میں اُس کی آواز بتدریج بلند ہوتی گئی۔ میری بیوی نے اُسے پھر آہستہ بولنے کی تاکید کی۔ اور اپنی کوشش کو بے نتیجہ سمجھ کر اُس نے دروازے کو ذرا سا کھولا۔ اور درز میں سے جھانکا یہ اندازہ کرنے کے لئے کہ بڑھیا کے شور سے میں کہیں بے آرام تو نہیں ہو گیا۔

میں نے غالباً اس خیال سے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ کہ مجھے سوتا سمجھ کر شاید بڑھیا اپنی باتوں کو کسی اور وقت کے لئے ملتوی کر دے۔

میری بیوی نے مجھے نیند کی حالت میں دیکھ کر قدرے اطمینان کا سانس لیا۔ دروازہ آہستگی کے ساتھ بند کر کے سرگوشی جیسی آواز میں بڑھیا سے کہا۔" سو گئے ہیں۔ اونچا بولنے سے بے آرام نہ ہو جائیں؟"

"سونا اچھا ہے۔ پسینہ آجائیگا۔ پسینہ آیا۔ بخار ٹوٹا۔ میری نواسی کا بخار پسینہ آتے ہی اُتر گیا تھا۔"

مجھے ہنسی آگئی۔ کیونکہ خاموش رکھنے اور خاموش رہنے کی انتہائی کوشش کے باوجود میری بیوی نسائیت کے فطری تجسّس سے باز نہ رہ سکی تھی۔ وہ بڑھیا سے اُس کے لڑکے لڑکیوں کے متعلق سوال کرنے لگی۔ اتنا سہارا بہت تھا۔ باتونی بڑھیا کو اپنی اولادوں کے طولانی تذکرے چھیڑنے کا موقعہ مل گیا۔

میری نفرت رحم سے بدل رہی تھی۔ بدنصیبی نے موت کو بڑھیا کے کنبے پر مسلّط کر دیا تھا۔ ایک اندھی نواسی کے سوا اب دنیا میں اس کا کوئی نہ تھا۔ دو بیٹے اور پانچ بیٹیاں بے پناہ طاعون کی نذر ہو چکے تھے۔

آہ موت!

میرا تصوّر بڑھیا کی بدنصیبی سے گزر کر اپنے بھائیوں بہنوئیوں کی جوانامرگی کا منظر پیش کر رہا تھا۔ وہ بھی وبائے طاعون کا شکار ہو گئے تھے

اور انہوں نے بھی مجھے اس وسیع دُنیا میں تنہا چھوڑ دیا تھا۔

موت کی کہانی۔ اور مرنے والے عزیزوں کی یاد کتاب حیات کا خیال انگیز باب ہے۔ دوسرے کمرے میں بڑھیا اپنی بد نصیبی کی داستان دہرا رہی تھی۔ میری بیوی مجھے دوا دینا بھول گئی تھی۔ میں بھی اپنے بخار کی نازک مزاجی کو فراموش کر کے بڑھیا کے بیٹے بیٹیوں کی روداد مرگ کے سلسلے کو اپنے خاندان کی برباد کہانی میں باندھ رہا تھا۔

میں ان سیمیائی نظاروں ہی میں محو تھا۔ کہ بڑھیا کا افسانۂ حیات کہیں سے کہیں پہنچ گیا۔ وہ اپنے دامادوں اور بیٹوں بیٹیوں کی موت سے ان کی شادی بیاہوں پر پہنچ گئی۔ اور اس کے بعد اپنے خاوند کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنے بیاہ اور سونے چاندی کے زیوروں۔ گوٹے والے جوڑوں کے فراہم کرنے میں اپنی ماں کی سرگرمیوں کا ذکر کرنے لگی پھر اپنی کم سنی کا قصہ لے بیٹھی۔

مجھے پھر بخار کی شدت محسوس ہونے لگی تھی۔ کیونکہ موت کی داستان ختم ہو چکی تھی اور میرے عزیزوں کی روحیں جو شاید بڑھیا کی باتوں سے کھنچ کر میرے کمرے میں جمع ہو گئی تھیں۔ پھر اپنی دنیائے فراموش میں روپوش ہو گئی تھیں۔

مَیں نے کروٹ بدلی۔ اور ارادہ کرنے لگا۔ کہ بخار کی بے چینی کا بہانہ کر کے شادی بیاہ کے اس بے سنگم ہنگامے کو خاموش کر دوں جو دوسرے کمرے میں برپا تھا۔ مَیں سوچ رہا تھا۔ کہ اپنی بیوی کو بلا کر تنبیہہ کروں۔ کیونکہ وہ بڑھیا کی داستانوں میں ڈوب کر مجھے دوا پلانا بھول گئی تھی۔

لیکن میرے ارادہ کرتے کرتے بڑھیا کے قصے نے ایک اور پلٹا کھایا۔ شاید سب عورتوں میں تجسس کا مرض ہوتا ہے۔ مَیں نے سُنا۔ میری بیوی بڑھیا سے پوچھ رہی تھی۔ " اچھا اماں تمہارا بیاہ بھی اتنی چھوٹی سی عمر میں ہو گیا تھا؟"

نہ جانے کیوں مجھے بڑھیا کا جواب سننے کا شوق پیدا ہوا؟

بڑھیا کہہ رہی تھی :۔

" یہ میرے دادا کی ضد تھی۔ وہ رات دن میرے باپ کو مجھے بیاہ دینے کی تاکید کرتا رہتا تھا۔ مَیں اُن دنوں شاید پورے دس برس کی بھی نہ تھی۔ وہ جب بھی رات کا کھانا کھا کر حقہ لے کر بیٹھتا۔ میرے ماں باپ کو اپنے پاس بلا لیتا۔ پھر تینوں باتیں کرتے۔ اور ان باتوں کا خاتمہ ہمیشہ میرے

"دن بہ دن" بڑھتے جانے۔ اور میرے شادی بیاہ کی سوچ پر ہوتا۔

ہمارا گاؤں یہاں سے بہت دُور چالیس کوس کے فاصلے پر ہے۔ میری دادی مر چکی تھی۔ میرا دادا گاؤں کا چرواہا تھا۔ وہ بچپن سے مجھے بہت پیار کرتا تھا۔ اُٹھائے اٹھائے پھرتا لیکن جیسے جیسے میں بڑی ہوتی گئی۔ اُس کی نرمی سختی سے بدلتی گئی۔ وہ میری شادی کے بعد کتنی ہی مدّت زندہ رہا۔ میری ماں کہتی تھی۔ مرنے سے پہلے اُس کے اُکھڑے ہوئے دانت پھر اُگنے لگے تھے۔ کیونکہ اُس کی عمر سو سال سے زیادہ ہو گئی تھی۔

اب بھی مجھے اُس کی سفید برّاق سی داڑھی اور لٹکی ہوئی سفید بھویں۔ اور دھوپ میں تمتمایا ہوا چہرہ اور لال لال آنکھیں یاد آتی ہیں تو ڈر جاتی ہوں۔ گاؤں کی سب لڑکیاں اُس سے ڈرتی تھیں۔ جب شام کے وقت وہ بکریوں کا ریوڑ لیے ہوئے جنگل سے گاؤں میں داخل ہوتا تو سب چھوٹی بڑی لڑکیاں اپنی گوکلیاں چھوڑ کر گھروں میں بھاگ جاتیں۔ وہ ہمیشہ اُن کو گاؤں سے باہر کھیلنے کو منع کیا کرتا تھا۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے۔ میں اپنی ہم سن سہیلیوں کے ساتھ شام

کے وقت گھر سے کچھ فاصلے پر میدان میں آنکھ مچولی کھیل رہی تھی۔ مَیں چور تھی۔ اور میری ململ کی اوڑھنی میری آنکھوں پر بندھی تھی۔ لڑکیاں کھلکھلاتی تھیں۔ مجھے چھُو کر اِدھر اُدھر بھاگ جاتی تھیں۔ اور مَیں اُن میں سے کسی ایک کو پکڑ لینے کے لئے ہاتھ پھیلا پھیلا کر گھومتی جاتی تھی۔

ایکا ایکی مَیں گر پڑی۔ لڑکیاں اِدھر اُدھر بھاگ کر اپنے اپنے گھروں میں چلی گئیں۔ مَیں نے گھبرا کر دونوں ہاتھوں سے اوڑھنی کو اپنی آنکھوں پر سے کھینچ لیا۔ دیکھا تو بکریاں میرے اُوپر سے گزر رہی تھیں۔ مَیں سہم گئی۔ میرا دادا میرے سر پر موجود تھا۔ مَیں اُٹھ کر بھاگی۔ اور گھر میں آ کر چُپ چاپ اپنے لحاف میں چھپ گئی۔

میری ماں چولھے کے پاس بیٹھی مکئی کی روٹیاں پکا رہی تھی۔ مَیں نے لحاف کے ایک کونے کو سرکا کر دیکھا۔ تو وہ گھونگٹ نکال رہی تھی۔ وہ میرے دادا کے سامنے ہمیشہ گھونگٹ نکال کر بیٹھا کرتی تھی۔

اب مَیں جان بوجھ کر ایسی بن گئی جیسے سو رہی ہوں۔

تھوڑی دیر بعد میرا باپ بھی کھیت میں کام کر کے آ گیا۔ ماں نے روٹیوں کی چنگیر اور ساگ کی رکابی دونوں کے سامنے رکھ دی جب دونوں کھا چکے

تو ماں نے میرا نام لے کر آواز دی۔ مَیں بولنا نہیں چاہتی تھی۔ ماں نے آپ ہی کہا ”سو گئی ہے۔ صبح کھائے گی۔“ پھر آپ بچی کھچی روٹی کھانے میں مصروف ہو گئی۔

انگنائی کے چھپر میں دادا کے حُقّے کی آواز گونج رہی تھی۔ مَیں سُن رہی تھی۔ اُس نے کھانستے ہوئے میرے باپ کو مخاطب کر کے کہا:

”چھوکری کا بیاہ کر دے۔“

میرا باپ شاید ہر روز کی رٹ سے تنگ آچکا تھا۔ اُس نے جواب دیا ”بھاگی تو نہیں جاتی۔“

دادا نے خاموش رہ کر پھر کہا۔ ”زمانہ اچھا نہیں۔ جوان لڑکی کو بٹھا رکھنے سے آبرو اُتر جائے گی۔“

میری ماں دادا کے سامنے کم بولتی تھی۔ مگر یہ سُن کر وہ بھی نہ رہ سکی۔ روٹی کھاتے کھاتے دُور ہی سے بول اُٹھی۔ ”آبرو اُترے دُشمنوں کی چھوکری جوان کاہے سے ہو گئی۔ پُوری نو سال کی بھی نہیں۔“

تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ صرف حقّہ زور زور سے بول رہا تھا۔ دادا کو کھانسی اُٹھی۔ پھر بولا ”دن اچھے نہیں۔ تُو نے اُن دونوں بھائیوں

کا ذکر سنتا ہے۔ جن کو پھانسی کا حکم ہوا تھا۔ پھر بڑی عدالت نے رحم کر کے کالے پانی بھیج دیا تھا؟"

میرے باپ نے کہا: "میرے ہوش سنبھالنے سے پہلے کی بات ہے۔ سُنا ہے۔ انہوں نے ذیلدار کے لڑکے کو مار ڈالا تھا۔"

دادا نے بڑے جوش سے کہا: "ہاں مار ڈالا تھا۔ مار ہی ڈالنا چاہیئے تھا۔"

مَیں لحاف کے اندر سہم گئی۔

میرا دادا کہہ رہا تھا:۔

"دُولو چوہدری اس گاؤں کا نمبردار تھا۔ وہ دو لڑکے اور ایک چھوٹی سی لڑکی چھوڑ کر مر گیا۔ ان کی ماں خاوند کے غم میں یا کسی بیماری سے اندھی ہو گئی تھی۔ بیچاری بڑی اچھی تھی۔ بڑی نیک تھی۔ پچھم کی پٹی میں ساری زمینیں ان لڑکوں کی تھیں۔ دُولو کے مر جانے پر ذیلدار نے لڑکوں کو اُکسا اُکسا کر اور روپیہ دے کر اُن سے باپ کے مرنے کی بڑی بھاری ضیافت کرائی۔ اردگرد کے سب گاؤں کھانے کے لئے جمع ہوئے

تھے۔ پھر مقدمے میں پھنسا کر ساری زمین ہڑپ کرلی۔"

اسی طرح لوگ بڑے زمیندار بن جاتے ہیں۔

لڑکے باپ کی طرح بڑی آن والے تھے۔ محنت مزدوری کرتے اور اپنی اندھی ماں اور بہن کا پیٹ پالتے۔ مگر ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دیتے تھے۔ پر ہائے۔ یہ لڑکیاں دشمن کے گھر بھی پیدا نہ ہوں۔ رہیں تو کنگال کی رہ جائیں۔ نہ رہیں تو بادشاہ کی نہ رہیں!"

میرا باپ بولا۔"قتل میں اس لڑکی کا بھی دخل تھا؟"

دادا نے کہا۔"قتل ایسی ہی باتوں پر ہوا کرتے ہیں — زن۔ زر زمین۔"

"چودھری تو مرا ہے۔ تو میں نے اس کو دیکھا تھا۔ ذرا سی تھی۔ مگر لڑکیوں کو جوان ہوتے دیر نہیں لگتی۔ لڑکپن ہی میں بیاہ کر دیتے تو اچھا ہوتا۔ مگر باپ مرچکا تھا۔ ماں بیمار تھی۔ بھائی کم سمجھ تھے۔ غریب اپنی مصیبت اور محنت میں پھنسے ہوئے تھے۔ کسی کا خوف نہ رہا۔"

اور زمیندار کا لڑکا —! "اچھا ہوا قتل ہو گیا۔ بچپن ہی ایسے تھے۔ بڑا بنا ٹھنا رہتا تھا۔ گلیوں میں گھوما کرتا۔ سر پر طُرّے والی پگڑی باندھتا۔

بہو بیٹیوں کو بُری نگاہ سے تکتا تھا۔ پاجی"۔۔۔

میرا دادا غصّے میں گالیاں بہت دیا کرتا تھا۔ اب اُس نے ذیلدار اور اُس کے خاندان کو گالیاں دینی شروع کیں۔ تھک گیا تو حقّہ پینے اور کھانسنے لگا۔

میرے باپ نے کہا: "اچھا تو یہ بات تھی؟"

"ہاں یہ اُن دنوں کا ذکر ہے۔ جب تیری ماں مرگئی تھی۔ تُو ابھی ڈیڑھ سال کا تھا۔ تیری نانی تجھے اپنے گاؤں میں لے گئی تھی۔ مَیں ندّی کے قریب کھجوروں والے بیہڑ کے سرے پر سارا دن بیہڑ میں بکریاں چراتا شام کو بکریاں گاؤں میں چھوڑ کر اسی کوٹھے میں آجاتا۔ اُن دنوں مجھے ایک فقیر نے وِرد کرنا بتایا تھا۔ مَیں آدھی رات تک وِرد کیا کرتا تھا۔ یہی اللہ رسول کا نام!"

گرمیوں میں ایک رات چاندنی کھلی ہوئی تھی۔ کوٹھے سے باہر میری کھاٹ بچھی تھی۔ چاند سر پر آگیا۔ مَیں وِرد ختم کر کے سونے کے لئے لیٹا۔ ہوا بند تھی۔ نیند نہیں آئی۔ گرمی تھی۔ مچھّر کاٹنے لگے۔ مَیں نے سوچا نہا لینا چاہیئے۔ نیند آجائے گی۔ مَیں اُٹھا۔ سانپوں کے ڈر سے لٹھ ہاتھ

میں لے کر ندی کی طرف چلا۔ دہنے ہاتھ کھجوروں کے جھنڈ جھکے ہوئے
اللہ میاں کی بندگی کر رہے تھے!"

"دس بارہ قدم ہی چلا تھا۔ کہ آہٹ سی معلوم ہوئی۔ جیسے کوئی
باتیں کر رہا ہو۔ مَیں ٹھہر گیا۔ اِدھر اُدھر دیکھا۔"

"جڑواں کھجوروں کی جڑ میں دو سائے لپٹے ہوئے تھے۔

میرے دل نے کہا۔ "چور!"

نہانا بھول کر مَیں نے ڈنڈے کو مضبوط تھام لیا۔ جھاڑیوں کی آڑ
لیتا ہوا دبے پاؤں چلا۔ اب وہ صاف نظر آتے تھے۔ مَیں کھجوروں کے
ایک چھوٹے سے جھنڈ کے پیچھے اُن سے دس قدم کے فاصلے پر کھڑا ہو گیا۔
اُن کی پیٹھ میری طرف تھی۔ مَیں سمجھا۔ یہ گاؤں میں کسی کا گھر لوٹنے کی
ترکیبیں سوچ رہے ہیں۔"

"مگر وہ جیسے بڑی فکر میں ہوں۔ کبھی کبھی ٹھنڈی سانسیں لیتے۔ کبھی
سسکیاں بھرتے۔ پھر باتیں کرنے لگتے۔ باتیں اچھی طرح سنائی نہ دیتی
تھیں۔ رفتہ رفتہ وہ بہت جوش میں آ گئے۔ اکھڑی اکھڑی باتیں کرنے
لگے۔ اِن باتوں سے مَیں سوچ میں پڑ گیا۔"

"وہ بار بار اپنی چھوٹی بہن کا ذکر کرتے۔ پھر ذیلدار کے لڑکے کو گالیاں دینے لگتے۔

"ذیلدار کا لڑکا۔ وہی حرامی پِلّا۔ میں اُسے جانتا تھا۔"

"جوان کنواری لڑکی۔" میں بہت کچھ سمجھ گیا۔ آوازیں جانی پہچانی تھیں۔ دونوں بھائی تھے۔ مرے ہوئے نمبردار ڈولو کے بیٹے ہیں جیسے پالے کے مارے سُن ہو گیا۔"

سمندرے نے کہا "آبرو اُتر گئی تو ناک کٹ جائے گی!"

بلندرے نے کہا: "میں تو پہلے ہی مر جاؤں گا!"

"دونوں پھر گہری سوچ میں پڑ گئے۔ میں کھڑا رہا۔ ذیلدار کے لڑکے پر میرا غصہ بڑھنے لگا۔ وہ تھوڑی دیر تک اسی طرح آہیں بھرتے رہے پھر اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ اپنی پگڑیاں اتار لیں۔ اور کھجور کے جھکے ہوئے تنے پر کمندوں کی طرح ڈال دیں۔" یہ کیا کریں گے۔" میں پتوں میں سے جھانکنے لگا۔ پھیکی پھیکی چاندنی میں ان کے پیلے اور اترے ہوئے چہرے مصنوعی سے معلوم ہو رہے تھے۔ وہ اپنے ہاتھوں سے اپنی پھانسیاں بنا رہے تھے۔"

میرے گھٹنے کانپنے لگے۔ وہ گلے بل رہے تھے اور اس خاموشی میں آہوں اور دبی ہوئی سسکیوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں پھر وہ درخت پر چڑھنے لگے۔ میں جیسے خواب دیکھ رہا تھا: "یہ کیا کریں گے پھانسیاں اپنی گردنوں میں ڈال لیں گے۔ پھر لٹک جائیں گے"۔ میں نے سُن رکھا تھا۔ ایسے بہتیرے قصّے سُنے تھے۔

"کسی فرشتے نے یک لخت مجھے اُن کے سامنے جا کھڑا کیا۔ وہ بہت ڈر گئے۔ اُن کے منہ سے ہلکی ہلکی چیخیں نکل گئیں۔ پھر اُنہوں نے مجھے پہچان لیا۔ درخت سے نیچے اُتر آئے۔ میں نے کچھ بھی نہ کہا۔ یہی تسلّی کی بات۔

وہ میرے ساتھ جھلّا روالے کوٹھے پر آئے چُپ چُپ تھے۔ چارپائی پر بیٹھ گئے۔ میں نے حقّہ بھرا پیتے رہے۔

آخر میں نے اُن کی کہانی سُن لی۔

ٹھنڈا پانی پلاتے ہوئے میں نے کہا: "اپنی جان کیوں دیتے ہو — مردانگی کرو —"

وہ دونوں چپ رہے۔ پھر بلندا بولا "گاؤں میں ہمارے کنبے کی بدنامی ہو جائے گی۔"

مَیں نے کہا "لڑکی کو کہیں باہر چھوڑ آؤ۔ دُور سَو پچاس کوس پر۔ اپنی نانی کے گھر——"

سمندرے نے جواب دیا "ماں کو کچھ خبر نہیں۔ اُس سے کیا کہیں!"

مَیں نے کہا "اس کو ساری کہانی بتا دو۔ غیرت والی ہے۔ خاوند کی عزّت پر مر مٹے گی۔"

مَیں نے دیکھا۔ دونوں کے چہرے چمک اُٹھے۔ بلندے کی آنکھوں کی چمک مجھے اب تک یاد ہے۔ حُقّہ بجھ گیا تھا۔ خبر نہیں اُنھوں نے کیا سوچا۔ کھڑے ہو گئے۔ مجھ سے قسمیں لینے لگے۔ پھر چلے گئے——"

دوسرے دن دوپہر سے پہلے مَیں بکریاں لے کر اُس کچّی سڑک کے کنارے گیا۔ جو ندی سے گزر کر بھیڑیں سے ہوتی ہوئی کالے جنگل میں سے ڈھائے والے گھاٹ جاتی ہے۔

بکریاں اِدھر اُدھر پھیل گئیں۔ کچھ اگلے گھٹنے ٹیک کر جھڑ بیریوں کے پتّے کھانے لگیں۔ سُورج سر پہ چلا آ رہا تھا۔ مَیں ایک وَن کے نیچے بیٹھا

تھا کہ وہ آ گئے۔ چادر میں لپٹی ہوئی وہ لڑکی ایک چھوٹے سے گھوڑے پر سوار تھی۔ دونوں بھائی ساتھ ساتھ پیدل جا رہے تھے۔ ہاتھوں میں ڈانگیں تھیں۔ جن پر لوہا چڑھا ہوا تھا۔

میں نے جان بوجھ کر صاحب سلامت کی

بلندے نے کہا: "بہن کو ننھیال چھوڑنے جا رہے ہیں۔ دریا پار۔"

میں نے کہا: "کب لوٹو گے؟"

سمندے نے کہا "دیکھئے!——"

وہ گزر گئے۔ میں دیکھتا رہ گیا۔ لڑکی مجھے یاد ہے مڑ مڑ کر تکتی جاتی تھی۔ چپ تھی۔ آدھا چہرہ چھپا ہوا تھا۔ آدھا میں نے دیکھا تھا۔ بالکل زرد۔ پھر اسے کسی نے نہ دیکھا۔

میں نے سارا دن یہیں گزار دیا۔ بار بار طرح طرح کے خیال آتے۔ "لڑکوں کو پتا پڑ گیا ہے۔ ہا۔ گاؤں میں پہلے تو ایسی باتیں نہیں ہوئیں یہ ذیلدار کے گھر میں کیا پیدا ہو گیا۔"

شام ہونے لگی۔ میں بکریوں کو گاؤں کی طرف لے جا رہا تھا بیریوں کے پاس ذیلدار کا لڑکا اور گاموں نائی گھوڑوں پر سوار ملے۔ گاموں کے پاس

چھپوی تھی۔ ذیلدار والے کے پاس ڈانگ تھی۔ دونوں اڑے ہوئے جا رہے تھے میری طرف دیکھا بھی نہیں.

میرا ماتھا ٹھنکا۔ گاموں بڑا نامی بدمعاش تھا۔ چوری میں پکڑا گیا تھا قید ہو چکا تھا۔ ذیلدار ہی نے اُسے قید کرایا تھا۔ اُسی نے ذیلدار کے لڑکے کو بدراہ کیا تھا۔ کھانے اڑانے کے لئے۔

مَیں دھڑکتے دل کے ساتھ بکریوں کو گاؤں میں لایا۔ پھر دولو کی حویلی پر گیا۔ بلندے کا نام لے کر آواز دی۔ بڑھیا کی آواز آئی "گھر نہیں ہے۔" مَیں جانتا تھا نہیں ہے۔ پھر آواز آئی "دونوں بھائی بہن کو ننھیال چھوڑنے گئے ہیں۔" مَیں سمجھ گیا ـــــ بڑھیا نے صبر کر لیا ہے!

سورج چھپ چکا تھا۔ بادلوں کی سُرخ دھاریاں کالی پڑ چکی تھیں. گھروں میں سے دھواں اُٹھ رہا تھا۔ میں گاؤں سے نکل آیا۔ خیالوں میں اُلجھا ہوا۔ سر جھکائے چھلاڑ والے کوٹھے پر گیا۔ آگ جلائی۔ روٹی پکائی۔ حلق سے نہ اُترتی تھی۔ حقّہ پینے لگا۔ پھر وضو کر کے وِرد کرنے بیٹھ گیا یہ پہلی بار تھی کہ مَیں بھول بھول جاتا تھا۔ میرا خیال کالے جنگل میں اُن بہن بھائیوں کے پیچھے پیچھے بھاگ رہا تھا۔

ذیلدار والا اُن کے پیچھے گیا ہے!"

مجھے بڑی فکر لگی ہوئی تھی۔ بیٹھا نہ گیا۔ اُٹھ کھڑا ہوا۔ اپنا لٹھ سنبھال کر چل پڑا۔ بیہڑ میں سے ہوتا ہوا۔ اُسی کچّی سڑک پر چلنے لگا جو کالے جنگل کو جاتی ہے۔ اُن دنوں مَیں بھی ہمت والا تھا۔

چاند نکلا ہوا تھا۔ بادل کے ٹکڑے بھی کہیں کہیں بھٹک رہے تھے۔ ارد گرد کھجوروں کے درخت۔ جھڑبیریاں اور کریر کے جھنڈ تھے۔ کہیں کہیں گیدڑوں کی دہکتی ہوئی آنکھیں نظر آئی تھیں۔ جو میرے ڈنڈے کے زمین پر بار بار کھڑکنے سے جھاڑیوں میں سے نکل کر بھاگ جاتے اور دُور جا کر دوسرے گیدڑوں کے ساتھ مل کر چلّانے لگتے تھے۔ کبھی کبھی چاند بادلوں میں چھپ جاتا۔ اور بیہڑ پر اداس اور بھیانک تاریکی چھا جاتی

مَیں دیر تک چلتا رہا۔ کھیت ختم ہو گئے۔ اب راستہ جنگل میں سے ہو کر گیا تھا۔

مَیں ٹھہر گیا۔ سوچنے لگا۔ وہ دوپہر سے پہلے چلے تھے۔ شام سے پہلے جنگل سے گزر کر دریا پار ہو گئے ہوں گے ——"

مَیں نے چاند کی طرف دیکھا۔ آدھی رات کا سماں تھا۔ وہ ضرور دریا

گزر کر پار ہو گئے ہوں گے ——"

"پھر ذیلدار کے لڑکے اور گاموں نائی کا خیال آیا۔ میں تھک گیا تھا۔ دس میل چل چکا تھا۔ ایک گرے ہوئے درخت کے تنے پر بیٹھ کر خیالوں میں ڈوب گیا۔"

"وہ اُن کے پیچھے گئے ہیں، بہت تیز گھوڑوں پر۔ اُن کے پاس ہتھیار ہے۔ راہ میں جا پکڑا۔ تو لڑکی چھین لیں گے پھر لڑائی ہو گی۔ خون خرابا —— ہا۔"

"اب میں پھر اُٹھا۔ اور جنگل میں گھس گیا۔ کوئی مجھے لئے جا رہا ہے میں نے اُن کو راہ سمجھائی تھی۔ کہ لڑکی کو ننھیال چھوڑ آئیں۔"

جنگل میں گھُپ اندھیرا تھا۔ چاند بھی بدلی میں چھپ گیا تھا۔ ہوا بند تھی۔ درخت بھی کسی گہری سوچ میں چپ چاپ کھڑے تھے۔ صرف گیدڑ کبھی کبھی بول اُٹھتے۔ یا دُور سے اُلّو کی منحوس فریاد سُنائی دے جاتی تھی۔"

"مردوں کا دل سخت ہوتا ہے۔ پر اُس رات ہول نے میرا خون جما دیا تھا۔ کئی مرتبہ سانپ میرے پاؤں کے پاس سرسرا گئے۔ اور میں

اُچک اُچک کر پرے ہٹ گیا۔ مَیں نے اپنے وِرد کو دُہرانا شروع کیا۔
اللہ رسولؐ کے نام سے جی ٹھہر جاتا ہے!"

"چاند پھر نکل آیا تھا۔ مگر یہ کالا جنگل تھا۔ اندھا اور ویران اُدر ڈراؤنا۔
مَیں چلتا رہا۔ مارا مارا کرتا ہوا چلتا رہا۔ چلتا جا رہا تھا۔ کہ بڑے زور کی آہٹ ہوئی۔ گھوڑے کی ٹاپ۔ مَیں بھاگ کر ایک طرف ہٹ گیا۔ جیسے کسی نے اُٹھا کر سڑک سے پرے پھینک دیا ہو۔ ایک جھڑبیری کے پیچھے سے دیکھنے لگا۔ گھوڑے کی ٹاپ نزدیک آتی گئی۔ ٹاپوں کے ساتھ ایک اور بھی آواز ملی ہوئی تھی۔ مَیں نے سُنا کوئی زور زور سے چیخ رہا تھا" مار ڈالا، خون کر دیا۔"

میرے دیکھتے دیکھتے گھوڑا بجلی کی طرح میرے سامنے سے گزر گیا۔
مَیں نے دیکھ لیا۔ گاموں نائی اس کی گردن سے لپٹا ہوا چیخ رہا تھا" مار ڈالا خون کر دیا۔"

"میری زبان پر خون کا سا ذائقہ آ گیا۔ آنکھوں میں لال لال لکیریں چمکنے لگیں۔ مَیں وہیں جم گیا۔"

گھوڑا غائب ہو گیا۔ ٹاپیں دُور ہوتی جاتی تھیں۔ اور وہ آواز بھی۔

مار ڈالا خون کر دیا۔" اور اس آواز کے ساتھ رات کی تاریکی اور جنگل کی خاموشی بھی پکار پکار کر کہہ رہی تھی "خون کر دیا۔ مار ڈالا۔" آخر اسی طرح خاموشی ہو گئی۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ جنگل پہلے سے بھی زیادہ ڈراؤنا ہو گیا تھا۔

میں نے کہا "وہی ہؤا۔ جو ہونا تھا۔ ہونی اس کو گھیر کر ان کے نیچے لے گئی۔

میں سوچتا رہا۔ کیا کرنا چاہئے۔ آگے چلوں یا پلٹ جاؤں ایسی جگہ ٹھہرنا اچھا نہ تھا۔ مگر پاؤں من من بھر کے ہو گئے تھے۔ میں کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ اتنے میں پھر گھوڑے کی ٹاپ سنائی دی۔ اسی طرف سے۔ مگر نرم——

یہ ملبندا تھا۔ ڈیلدار والے کے گھوڑے پر سوار۔ آگے زین پر چھوٹے بھائی کو سنبھالے ہوئے۔ سمندا زخمی تھا۔ بے ہوش۔

میں جلدی سے نکلا۔ اور گھوڑے کے آگے جا کھڑا ہوا۔ چاند کی روشنی میں اُس نے مجھے بے پروا آنکھوں سے دیکھا۔ پہچان لیا۔ اس کا قد پہلے سے بڑا معلوم ہوتا تھا—— چہرہ بھیانک تھا۔ وہ مسکرایا——

وہ پکارا "ہو گیا ـــــ"

مَیں نے پوچھا "کیا ہوا ـــــ؟"

اُس نے زور سے کہا۔ ہو گیا سب کچھ ہو گیا۔ وہاں پڑا ہے ریت پر۔ مُردہ۔ لہُو میں نہایا ہوا بانکا۔ نائی بھاگ گیا ـــــ ہم بھی ہمارے پیچھے آئے تھے!!!

مَیں نے گھبرا کر پوچھا "لڑکی؟"

اُس نے قہقہہ لگا کر کہا "دریا میں! ہم وہیں سے لوٹے ہوئے آ رہے تھے۔ راہ میں یہ مِل گئے۔"

میرے مُنہ سے نکلا "بُرا ہوا۔"

وہ زور سے ہنسا "وہ سیدھی ننھیال پہنچ جائے گی۔ پھر ایک زور کا قہقہہ لگایا۔ جنگل نے بھی اُس کے ساتھ قہقہہ لگایا ـــــ پھر وہ بولا "عزت کے بدلے ـــــ"

مَیں کچھ کہنے ہی کو تھا۔ کہ اُس نے کہا "پلٹ جاؤ ـــــ تم کیوں آئے ہو ـــــ وہاں خون ہے ـــــ پلٹ جاؤ۔ گاموں بھاگا ہوا گیا ہے ـــــ مَیں اُس کے پیچھے جا رہا ہوں!"

"یہ کہہ کر اُس نے گھوڑے کو دوڑا دیا۔ مَیں کہتا رہ گیا: ٹھہر جاؤ۔ بتاتے جاؤ۔ گاؤں میں نہ جانا۔" مگر اُس نے نہ سُنا۔ جوان آدمی کسی کی نہیں سُنتا!"

"مَیں بھی اُس کے پیچھے پیچھے دوڑا۔ دوڑا نہ جاتا تھا میرے کپڑے پھٹ گئے تھے۔ خون کے خیال نے میرے لہو میں برف بھر دی تھی۔ خبر نہیں مَیں کب جنگل اور بیہڑ سے نکلا۔ جس وقت میں جھلار والے کوٹھے پر پہنچا۔ تو پو پھٹ رہی تھی ——"

"ذرا دن چڑھے مَیں گاؤں میں گیا۔ جس وقت روز بکریاں لانے جایا کرتا تھا۔ مَیں نے دیکھا۔ دَولو چودھری کے دروازے پر تھانہ اُترا ہُوا ہے۔"

"سارا گاؤں جمع تھا۔ دونوں بھائیوں کے ہاتھ پیر باندھے ہُوئے تھے۔ گامُوں نائی راتوں رات پولیس والوں کو لے آیا تھا۔ اور اب بڈھا ذیلدار اپنے بیٹے کی لاش لانے کے لئے سپاہیوں کے ساتھ کالے جنگل کی طرف جا رہا تھا۔ مَیں وہاں تھوڑی دیر ٹھہرا۔ دونوں بھائی چپ چاپ بیٹھے تھے مجھے اُنہوں نے ایسی نظر سے دیکھا جس سے فتحمندی ظاہر ہوتی تھی۔ اُن

کی ماں دروازے کی اوٹ میں بَین کر رہی تھی۔ مَیں بکریاں لے کر چلا آیا۔

بیچاری بُڑھیا تھوڑے دن زندہ رہی۔ جس دن دونوں بھائیوں کو کالے پانی کی سزا ہوئی۔ مَیں نے اپنے ہاتھ سے اُس کو قبر میں اتارا تھا۔۔۔۔!"

یہ گھر ایک جوان لڑکی کے بٹھا رکھنے سے اُجڑ گیا۔"

"دیکھا جوان لڑکی کے نہ بیاہنے کا نتیجہ۔" بُڑھیا دایہ نے میری بیوی کو بڑے وثوق سے کہا۔" اپنے دادا سے یہ کہانی سُن کر مَیں کانپتے کانپتے سو گئی۔ پھر میرے باپ نے تیسرے مہینے میری شادی کر دی۔ اور ——"

خبر نہیں بُڑھیا نے اور کیا کیا کہا۔ مَیں اپنی چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ اور کالے جنگل میں اس رات کے قتل کا بھیانک اور ہیبت ناک نظارہ دیکھ رہا تھا۔ تصوّر مجھے اُس جگہ لے گیا۔ جہاں ذیلدار کے اوباش لڑکے کا بانکا جسم خون میں نہایا پڑا تھا۔ وہ جسم، وہ چہرہ جسے وہ بنائے سنوارے رکھتا تھا۔ زخموں اور موت کے کرب سے ڈراؤنا ہو گیا تھا۔ وہ آنکھیں پتھرا چکی تھیں۔ وہ ڈھیلے باہر نکلے ہوئے تھے۔ جن سے وہ لوگوں کی بہو بیٹیوں پہ نگاہیں ڈالتا تھا۔

پھر میں نے تصوّر ہی تصوّر میں اُن دونوں بھائیوں کو کالے پانی میں دیکھا۔ جن کی آنکھوں میں سے غیرت کی آگ چنگاریاں بن کر نکل رہی تھی۔ اور وہ بد نصیب لڑکی —— جس کو سگے بھائیوں نے اپنے ہاتھوں سے گہرے پانی کی ہولناک موجوں میں دھکیل دیا تھا ——"

میری چارپائی گویا بھونچال سے کانپ رہی تھی۔

اسی وقت ان وحشت ناک خیالوں میں مجھے ایک نازک سے قہقہے کی آواز سُنائی دی۔ نیچے کی منزل میں میری ننّھی لڑکی کسی بات پر کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔ مجھے اس کی آواز سنائی دی۔ اور ایک شیریں راحت نے میری پلکیں ملا دیں۔ مجھے اپنے گوشۂ چشم پر آنسوؤں کی ہلکی ہلکی حرارت محسوس ہو رہی تھی۔

خبر نہیں بُڑھیا آپ بیتیاں ختم کر کے کب چلی گئی۔ جب بیوی نے مجھے دوا پلانے کے لئے اُٹھایا۔ تو میں پسینے میں نہایا ہوا تھا؛

مکتبۂ شریف عباسی۔ گجرات
اپریل۔ ۱۹۵۹ء

ہفت پیکر تو آپ دیکھ چکے اب افسانوں کا ایک مجموعہ

معیاری افسانے

طلب کیجئے

یہ افسانے دنیا کے بہترین افسانوں سے انتخاب کئے گئے ہیں۔

حفیظ صاحب نے رسالہ مخزن کی ادارت کے زمانہ میں روسی۔ انگریزی۔ فرانسیسی۔ بنگالی اور چینی زبان کے افسانہ نگاروں کے شاہکار افسانے مہیا کئے۔ اور اپنے احباب سے اُن کو اردو میں منتقل کرنے کی فرمائش کی۔ جب یہ اُردو میں منتقل ہو چکے تو ان میں سے متعدد کو اپنے مذاق کے مطابق اصلاح دی۔ اور بعض کا پلاٹ تو وہی رہنے دیا۔ لیکن فضا اور ماحول تبدیل کر کے اُنہیں اور ہی قالب میں ڈھال دیا۔

نمونے کے طور پر بعض افسانوں کے چند بہت ہی مختصر اقتباس دئے جاتے ہیں۔

"عورت یا شیر"

خونخوار جلادوں نے تمام سلطنت کے پنجرے دیکھے بھالے۔ تاکہ سب سے زیادہ تند۔ سب سے زیادہ ظالم اور سب سے زیادہ ہیبت ناک شیر منتخب کیا جا سکے ——— فن کے بڑے بڑے ماہروں نے تمام ملک کی عورتوں میں سے ایک بہترین دوشیزہ تلاش کی تاکہ اگر اس نوجوان کی قسمت کا ستارا اُسے معصوم ثابت کر دے۔ تو اس الزام کی نسبت سے اتنا ہی بڑا انعام بھی دیا جائے ——— مقررہ دن آن پہنچا۔ قرب وجوار کے لوگ اکٹھے ہو گئے تماشاگاہ تماشائیوں سے بھر گئی۔ اور ایک کثیر التعداد انبوہ جسے اندر جگہ نہ مل سکی۔ اکھاڑے کے باہر جمع ہو گیا ——— راجہ نے اشارہ کیا۔ شاہی نشستوں کے نیچے کا دروازہ کھلا اور

راج کماری کا جاں نثار اکھاڑے میں داخل ہو گیا ——— جب نوجوان نے اکھاڑے میں قدم رکھا۔ تو دستور کے مطابق وہ راجہ کی تعظیم کے لئے جھکا۔ لیکن اس وقت اُس نے راجہ کی موجودگی کا مطلق احساس نہ کیا۔ اُس کی آنکھیں خوبصورت راج کماری پر جمی ہوئی تھیں۔ جو راجہ کے دہنے ہاتھ بیٹھی تھی ———

اُسے دروازوں کے راز معلوم تھے۔ اُس نے معلوم کر لیا تھا کہ دونوں دروازوں کے پچھلی طرف کس کمرے میں بھوکا شیر خوفناک دانت نکالے کھڑا ہے اور کس کمرے میں حسین عورت بیٹھی انتظار کر رہی ہے ——— راج کماری جانتی تھی۔ کہ کون سے دروازے کے پیچھے شیر ہے۔ اور نوجوان کو بھی یقین تھا کہ وہ ضرور جانتی ہے ——— نوجوان کی متجسس۔ آرزومند اور پُرشوق نگاہ نے پوچھا۔ "کدھر؟" ———

راج کماری نے اپنا داہنا ہاتھ اُٹھایا ——— اور اُس کی روشن آنکھوں میں سے نگاہ نے داہنی جانب جنبش کی ——— وہ کسی پس و پیش کے بغیر داہنی جانب کے دروازے کی طرف چل دیا، اور ہچکچاہٹ کے بغیر اُسے کھول دیا ——— اب اس کہانی کا آخری معمہ یہ ہے کہ اس دروازے میں سے شیر نکلا یا عورت؟

یہ پورا افسانہ سولہ صفحوں پر پھیلا ہوا ہے۔

ایک دوسرے افسانے کا مختصر اقتباس:۔

"محتاج کا دل"

بڑھیا نے جھڑک کر کہا: نہیں رے یہ کام پھر کبھی نہ کیجو۔ میں تجھے کبھی نہ کرنے دونگی۔ کان کو ہاتھ لگا۔ توبہ کر۔ پھر کبھی نہ کروں گا ——— کلو نے کچھ جواب نہ دیا۔

پانچ پیسے آجانے سے چولھا بھی سلگا، ہنڈیا بھی چڑھی۔ اور مالک مکان کو بھی کچھ دے دیا گیا۔ لیکن ہفتے ہی بھر میں کوڑی کوڑی خرچ ہو گئی۔ اب ان کے پاس ایک ملیہ بھی

نہ تھا کہ چنے چبا کر گزارہ کرتے۔ کلو کنجڑوں کی دو کانوں کے آگے سے ڈنٹھل وغیرہ اُٹھا لایا۔ اور انہیں نمک مرچ لگا کر سب نے پیٹ بھرا ــــــــ اگلے روز کلو نے نہایت دلیری کے ساتھ اپنی ماں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور کہا:۔ "لو میں جاتا ہوں" ــــــــ بڑھیا چلّا اُٹھی۔ "کلو بیٹا ٹھہر جا۔ تجھے قسم ہے ــــــــ لیکن کلو نہ ٹھہرا۔ اور بھاگ کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ بڑھیا بیچاری قسمت کو رو کر بیٹھ گئی ــــــــ ایک گھنٹہ کے بعد تینوں لڑکیوں میں سے سب سے بڑی نے کہا "امی جان۔ ساتھ والی ہمسائی نے بجھے ہوئے کوئلے دیئے ہیں۔ کہو تو آگ سلگا لوں۔ ٹھٹھرن لگ رہی ہے۔" ــــــــ غریب بڑھیا نے لمحہ بھر پس و پیش کی۔ تب اُس کے گالوں پہ ہلکی سی سُرخی دوڑ گئی۔ اُس نے کہا "نہیں بیٹی .... آگ نہ جلانا ہی اچھا ہے .... کیا جانے تمہارا بھائی آج بھی ــــــــ ؟"

پورا افسانہ بارہ صفحے کا ہے۔

ایک اور افسانے کی چند سطور ملاحظہ ہوں:۔

"چنگیز خاں اور اُس کے پوتے کی کہانی!"

خان نے نرمی سے کہا: "اٹھ تو ہمارے ساتھ چلے گی" ــــــــ تب اُس نے ہلاکو اور اُن آنسوؤں کو دیکھا۔ جو اس کے بوڑھے عظیم الشان خاں کی آنکھوں سے بہ رہے تھے۔ وہ معاملہ شناس تھی۔ ایک آن میں بات کی تہ کو پہنچ گئی ــــــــ اُس نے کہا "چلو میں تیار ہوں۔ میں نہ ایک کے لئے ہوں، نہ دوسرے کے لئے! یہی نا۔"

تینوں خاموشی کے ساتھ خیموں کی طرف چل کھڑے ہوئے ــــــــ وہ دیر تک چلتے

رہے۔ آخر کار جیحوں کی تُند موجوں کا ابتدائی شور اُنہیں سُنائی دیا۔ ہلاکو جو اپنے دادا کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ یکایک بولا "مجھے آگے آگے چلنے دے بابا۔ طبیعت مجھے اُکسا رہی ہے کہ میں اپنا خنجر تیری گردن میں پیوست کر دوں" —— لامحدود چٹانوں کے قدموں میں۔ اندھیرے۔ ٹھنڈ اور خوف میں گھری ہوئی پانی کی موجیں اپنے اپنے راگ گاتے جا رہی تھیں —— "مجھ سے اپنے آپ نہیں گرا جاتا۔ تم مجھے پکڑ کر نیچے پھینک دو" —— ہلاکو نے پھر اپنے ہاتھ اُس کی طرف بڑھائے مگر وہ خان کے بازوؤں میں چلی گئی —— نہ کوئی صدا اُبھری۔ نہ کوئی چیخ بلند ہوئی۔ —— بادل تاریک اور اداس تھے اس بوڑھے خان کی طرح تاریک اور اداس جو اس وقت بلند چٹانوں کے اوپر لیٹا تھا —— ہلاکو نے پکارا "بابا! چلو محل میں چلیں" —— وہ تھوڑی ہی دُور چلے تھے کہ خان رُک گیا۔ اُس نے کہا۔ "دیکھ جب تو کسی انسان کا دامن محبت سے خالی دیکھے تو سمجھ لے کہ اُس کا جینا بے فائدہ ہے"۔ "لیکن فاتح بابا تیرے پاس دولت ہے طاقت ہے۔ شہرت ہے" —— "مجھے صرف اُس کی ایک مسکراہٹ لادے اور تو یہ سب کچھ اپنے لئے لے لے" —— "خان نے اپنا رُخ جیحوں کی طرف پھیر لیا" —— ہلاکو خاں دیر تک چٹان سے نیچے دیکھتا رہا آخر کار اُس نے بلند آواز میں کہا۔ "غیر فانی دیوتاؤ مجھے بھی ایسا قوی دل دیجیو"۔

یہ پُوری کہانی ۱۰ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔

اس کتاب میں ۱۸ معیاری افسانے ہیں۔ اور دعوے سے کہا جا سکتا ہے کہ افسانوں کا کوئی مجموعہ اپنی معنویت کے لحاظ سے اس کتاب کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ صفحے ۲۲۴ مجلد

"معیاری افسانے"

ہر تاجر کتب سے طلب کیجئے یا براہِ راست منگائیں